برقِ تبسم

شوکت تھانوی

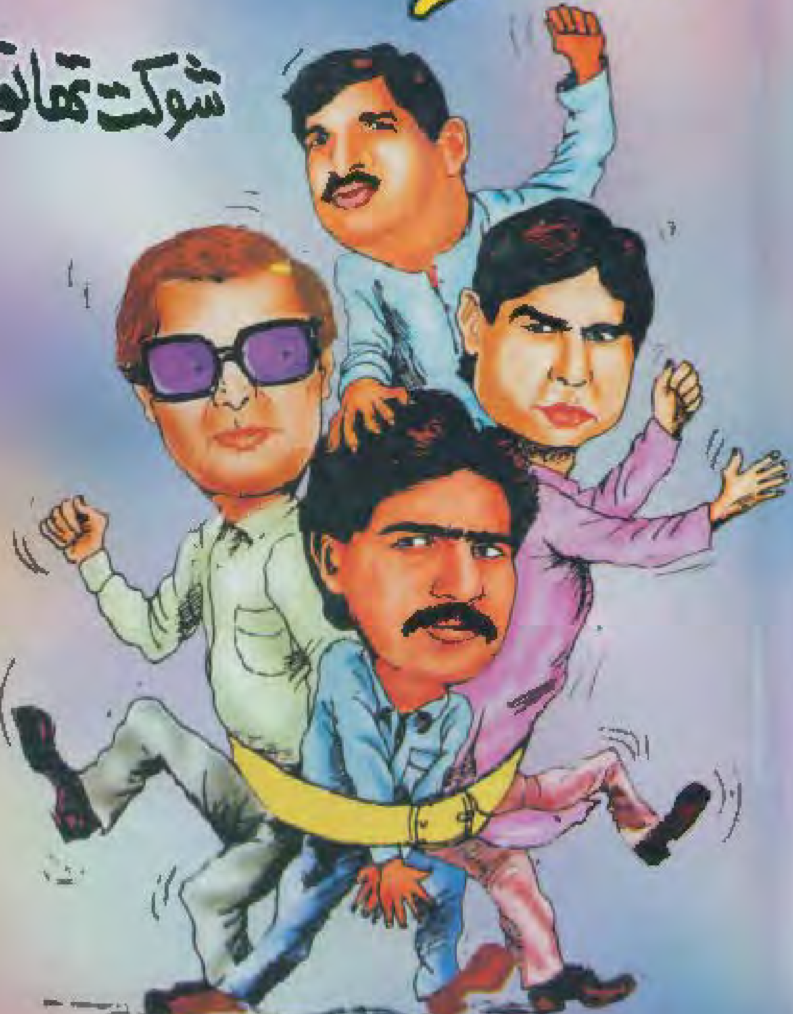

برقِ تبسم

شوکت تھانوی

رابی کتاب گھر
C-20۔ جیوتی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔ 110032

نام کتاب : برقِ تبسم
مصنف : شوکت تھانوی
سن اشاعت : ۲۰۰۹ء
قیمت : =/180 روپے
مطبوعہ : فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی۔ 32
ناشر : راہی کتاب گھر، C-20۔ جیوتی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔ 110032

ISBN-81-88645-46-X

arq-e-Tabbassum
y.: Shaukat Thanvi
rice : Rs.180/=
dition : 2009
AHI KITAB GHAR
-20, Jyoti Colony, Loni Road,
hahdara, DELHI-110032
lobile : 9818786196

ole Distributors:-
ITAB WALA
794, Gali Jhot Wali,
hari Bhojla, DELHI-110006
n.: (O)23281499, 9810277298

انتساب

اپنے بھائی مولانا ارشد تھانوی
کے نام
دنیا میں اب صرف وہی باقی رہ گئے ہیں
جو ہم کو خوبصورت سمجھتے ہیں

شوکت تھانوی

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام نام، واقعات، کردار، اور مقامات قطعی فرضی ہیں۔ کسی زندہ یا مردہ شخص سے مطابقت محض اتفاقیہ امر ہوگی، جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

افیونی کی جنت

میر صاحب نے اپنے دونوں گھٹنوں کے اندر سے سر نکالتے ہوئے کہا۔ ’’بھائی سچ تو یہ ہے کہ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ چند روزہ زندگی خدا اسی طرح کاٹ دے پھر مرنے کے بعد تو خدا جانے ہم افیونیوں کا کیا حشر ہوگا۔‘‘

مرزا صاحب نے جو اپنی پیالی کے اندر گویا خود ہی حل ہو جانے کے قریب تھے خفیف سا اُبھرتے ہوئے کہا۔ ’’مرنے کے بعد حشر کیا ہوگا۔ اماں جنت میں ہم افیونی نہ جائیں گے تو اور کون جائے گا۔ ہم نہ کسی کے اچھے میں نہ بُرے میں، نہ ہم کو چوری سے مطلب نہ کسی اور بُرے کام سے۔ بس ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ہم کو تو سچ پوچھئے گناہ کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی اور یہی سب سے بڑا ثواب ہے کہ انسان گناہ نہ کرے۔ پھر بھلا جنت ہمارے لیے نہیں تو کیا ان لوگوں کے لیے ہے جو پینک کو تو بُرا کہتے ہیں مگر دنیا بھر کی روسیاہیوں کو نہیں دیکھتے۔‘‘

خان صاحب نے طلسم ہوشربا کی جلد کے اندر سے نکلتے ہوئے فرمایا۔ ’’سچ کہتے ہو بھائی مرزا ہم لوگ تو واقعی جنتی ہیں۔ سولہ آنہ جنتی اور جو ہم کو جنتی نہ سمجھے اس پر اسی کالی گولی کی مار پڑے۔‘‘

مرزا صاحب نے اپنی نیم وا آنکھوں سے خاں صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اماں آج اس افیون اور ہم افیونیوں پر ہنسنے والے ہنس لیں ہم کو بُرا کہنے والے خوب جی کھول کر بُرا کہہ لیں مگر جب جنت میں دیکھیں گے تو……''

میر صاحب نے بات کاٹتے ہوئے ہمہ تن نون غنہ بن کر کہا۔ ''جی ہاں پھر پچھتائیں گے کہ زندگی میں اس افیون کی قدر نہ کی جو دنیا بھر کے گناہوں سے بچاتی ہے۔''

خاں صاحب نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''بھائی بات تو جب ہے کہ ہم افیونیوں کو جنت میں بھی یہی صحبت ملے اور یہی محفلیں گرم رہیں۔ اللہ ہی جانے کہ وہاں افیون بھی ملے گی یا نہیں۔''

میر صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''یہ بھی آپ نے ایک ہی کہی کہ وہاں بھی افیون ملے گی یا نہیں۔ بھائی یہ تو سمجھو کہ وہاں سوائے افیون کے اور ہوگا کیا۔ میں تم کو اپنا ہی ایک قصہ سناتا ہوں کہ میں نے کیوں کر ذرا اسے دھوکے میں جنت کی سیر کی اور کل حالات معلوم کر لیے۔ ہوا یہ کہ اب سے دور میرا انتقال ہوگیا۔

خان صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ ''ایں کیا کہا انتقال ہوگیا؟ کیا تمھارا انتقال ہو چکا ہے؟''

میر صاحب نے کہا۔ ''ہاں ہاں بھائی انتقال ہوگیا تھا سنو تو سہی۔ بات یہ ہوئی کہ اوّل تو وقت کچھ ایسا آ پڑا تھا کہ دو دن تک پینے کو نہ ملی۔ ایک غیرت دار افیونی کے لیے یہی موت ہے۔ دوسرے ایک عجیب دھوکا یہ ہوا کہ میرے ہی محلّہ میں میرا ایک ہم نام قلعی گر رہتا تھا اس کو ہوا سرسام مگر نام کے دھوکے سے روح میری قبض کر لی گئی۔ اور فرشتے مجھ کو لے کر سیدھے جنت میں پہونچے۔ بس کچھ نہ پوچھئے کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ سب سے پہلے تو جنت کے دروازہ ہی پر میرا پرانا دوست منجھو جس کا تین برس ہوئے انتقال ہو چکا ہے ملا۔ اور مجھ کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔

''ارے بھائی میر صاحب تم کہاں؟''

میں نے اس کو اپنے انتقال پُر ملال کی خبر وحشت اثر سنائی۔ اس کو بھی سخت صدمہ ہوا۔ اور مجھ کو صبر کی تلقین کرنے لگا۔ کہ مشیت ایزدی یہی تھی اب رونے سے کیا ہوتا ہے خدا تم کو نعم البدل دے گا وغیرہ۔ مگر پھر وہ پینک سے خود ہی چونکا۔ اور اس نے کہا کہ اماں میر صاب بھلا یہ افسوس کرنے یا رونے کا کیا مقام ہے؟ اچھا ہوا کہ تم مر گئے۔ خدا ہر افیونی کو مرنا نصیب کرے اور سب مر کر یہاں آجائیں۔ اب تو اس کی اس بد دعا پر مُجھ کو بھی تعجب ہوا کہ آخر کہہ کیا رہا ہے۔ مگر اس نے میرے تعجب پر مسکرا کر کہا۔ میر صاحب کچھ کو خبر بھی ہے کہ تم جنت میں ہو۔ اس جنت میں جس کو دیکھ کر تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ چلو تم کو ذرا جنت کی سیر کراؤں۔ اس کے اس کہنے پر میں داروغۂ جنت کے دفتر تک گیا بلکہ سیدھا اس کے ساتھ ہو گیا اور اس کے پیچھے پیچھے جنت میں داخل ہو گیا۔ میں تم سے کیا بتاؤں کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ اماں دیکھتا ہوں کہ نہایت کشادہ سڑکوں پر دو رویہ افیون کے نہایت عالیشان محلات کھڑے ہوئے ہیں۔ اور سڑکوں کے دونوں طرف پوستے کے درخت قطار در قطار لگے ہوئے ہیں۔ جن سڑکوں پر ہم لوگ چل رہے تھے وہ سنگ مرمر کی معلوم ہوتی تھیں مگر سفید رنگ کی باریک ریت اور سفید چمکدار ڈھیلے بھی جا بجا پڑے ہوئے تھے۔ میرے دوست منجھو مرحوم نے کہا کہ اس سڑک کو بھی سمجھئے کہ کس چیز کی ہے۔ میں نے ابھی کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ اس نے مٹھی بھر دھول اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دی۔ بس سمجھ لو کہ منہ سے لے کر معدہ تک شیرینی کی لہر دوڑ گئی۔ اماں ایسی میٹھی شکر تو میں نے کبھی کھائی ہی نہیں تھی۔ میں تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیا تو منجھو مرحوم نے ایک ڈھیلا میرے منہ میں دے دیا۔ یہ دراصل مصری کا ڈلا تھا۔ بھائی ایسی

مصری اس دنیا میں سو روپیہ تولہ بھی ڈھونڈھو تو نہ ملے۔ عطر میں بسی ہوئی برف سے زیادہ ٹھنڈی رُوئی سے زیادہ ہلکی اور ایسی مفرح کہ میں کیا کہوں۔ بہرحال میں مزے لے لے کر مصری کھا ہی رہا تھا کہ منجھو مرحوم نے مسکرا کر پوچھا۔ کہو کچھ شغل ہوگا؟ میں تو چار دن کا ترسا ہوا تھا ہی نہایت اشتیاق کے ساتھ کہا کہ ''نیکی اور پوچھ پوچھ۔''

منجھو مرحوم نے وہیں پر ٹھہر کر کہا۔ ''تو پھر تکلف کس بات کا ہے۔ آخر یہ سب کس کے لیے ہے۔۔ جس عمارت سے چاہو اور جتنی چاہو افیون نوچ لو اور اگر گھلی گھلائی چاہتے ہو تو وہ دیکھو سامنے حوض ہے جس میں تم غوطہ تک لگا سکتے ہو۔''

افیون کی یہ کثرت دیکھ کر مجھ کو ایک قسم کا اطمینان سا ہو گیا اور میں نے اسی کو مناسب سمجھا کہ پہلے ذرا یہاں کی سیر ہو جائے اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر شغل ہوگا۔ چنانچہ منجھو مرحوم کے ہمراہ چلتے چلتے میں ایک باغ میں پہونچا جہاں گنڈیریوں کے نہایت شاداب درخت قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ یہ گنے کے درخت نہ تھے بلکہ چھلی ہوئی اور کٹی ہوئی گنڈیریوں کے درخت تھے بس یہ سمجھ لو کہ ان کو دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا منجھو مرحوم نے فوراً ایک گنڈیری توڑ کر مجھکو کھلائی تو آنکھیں کھل گئیں۔ اے سبحان اللہ کیا تعریف کی جائے اس گنڈیری کی۔ معلوم یہ ہوا کہ برفی کی لوزات میں انگور کا رس کسی نے معطر اور ٹھنڈا کر کے بھر دیا ہے یا پورا خطۂ کشمیر، دنیا بھر کی شیرینیوں میں لپٹ کر اور تمام دنیا کی خوشبوؤں میں بسنے کے بعد سمٹ کر گنڈیری بن گیا ہے۔ میں ابھی اس گنڈیری کا لطف ہی لے رہا تھا کہ منجھو مرحوم نے مجھ سے کہا۔

''میر صاحب وہ دیکھو سامنے چاء کی نہر بہتی ہے۔''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''چاء کی نہر۔'' تو منجھو نے مجھ کو نہر کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں! یہ چاء کی نہر ہے۔ اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی کشمیری چاء ہر وقت موج در موج بہتی ہے۔ اس نہر پر تین چار نہایت خوب صورت پل بھی بنائے گئے ہیں۔ ایک پل حلوہ سوہن کا ہے جو اس قدر خوش ذائقہ حلوہ سوہن کا بنا ہوا ہے کہ دہلی کا حلوہ سوہن آپ بھول جائیں۔ دوسرا پل رامدانے کی لیا کا ہے جس کو نہایت نزاکت سے بنایا گیا ہے۔ تیسرا پل قلاقند کا ہے۔ ذرا اس پل کا ایک ٹکڑا کھا کر دیکھو کس قدر مزیدار ہے۔ چوتھا پنچ میل مٹھائی کا ہے۔ ان پلوں پر جا کر تم اس نہر کی سیر کر سکتے ہو۔'' میں آئینۂ حیرت بنا ہوا منجھو مرحوم کے پیچھے پیچھے نہر تک پہنچ گیا۔ اور حلوہ سوہن کے پل کے اوپر جا کر نہر کی سیر کرنے لگا۔ اس نہر میں واقعی نہایت لاجواب قسم کی کشمیری چاء کا دھارا بہہ رہا تھا۔ جس میں برابر کی بالائی پڑی ہوئی تھی اور خوشبو سے باپ دادا تک کی روحوں کے دماغ معطر ہوئے جاتے تھے۔ پھر اس نہر کا منظر عجیب وغریب تھا۔ کہیں تو سنبوسوں کی خوب صورت کشتیاں رواں تھیں، کہیں شیر مالوں کے بجرے لنگر انداز تھے۔ اور پھر لطف یہ کہ اس نہر کا ہر بھنور ایک باقرخانی تیار کرتا تھا اور ہر حباب سے ایک بتاشہ بنتا تھا۔ میں دیر تک اس منظر میں گم رہا۔ آخر منجھو مرحوم نے مجھ سے کہا کہ ''چلو بھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ریوڑیوں کی بارہ دری، گزک کا قلعہ، فیرینی کا کنواں، شربت کا آبشار، گاجر کے حلوہ کی دلدل، گڑ کا پہاڑ وغیرہ۔'' میں ان میں سے ہر چیز کا نام سن کر سخت حیران ہوا۔ اور نہایت خاموشی کے ساتھ منجھو مرحوم کے ساتھ چل دیا۔ سب سے پہلے منجھو مرحوم نے مجکو ریوڑیوں کی بارہ دری دکھائی۔ اس بارہ دری کی ادنیٰ تعریف یہ ہے کہ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ اور کھاؤ تو ڈکار تک لینے کا ہوش باقی نہ رہے۔ چھوٹی اور بڑی خوشبودار ریوڑیوں سے اس بارہ دری کو کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ ریوڑیوں پر جواہرات کا شبہ ہوتا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ پچہ کاری کے فن کو اس عمارت پر ختم کر دیا گیا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس عمارت کے ستون

آپ کھائیے، مگر وہاں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔ اور جو ریوڑی جس جگہ سے آپ کھائیں اس کی جگہ ویسی ہی دوسری ریوڑی موجود۔ اگر یہ صنعت نہ رکھی گئی ہوتی تو اس بارہ دری کو لوگ کب کے ہضم کر چکے ہوتے۔ ریوڑیوں کی بارہ دری کے بعد گزک کا قلعہ بھی دیکھا۔ اماں یہ آگرہ اور دہلی کے قلعے اس کے سامنے بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں۔ اس قدر عظیم الشان قلعہ کہ جیسے پہاڑ کا پہاڑ کھڑا ہوا ہے اور کیا مجال کہ گزک کے علاوہ اس میں کوئی اور چیز لگی ہو۔ میں نے اس قلعہ میں بھی ایک اینٹ نکال کر کھائی۔ اور آج تک اس کا مزہ بھولا نہیں ہوں۔ حد یہ ہے کہ میں آگرہ وغیرہ کی گزک کو بھی اب نہیں چھوتا۔ جس کو سب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ گزک کا قلعہ دیکھنے کے بعد فیرنی کے کنویں پر گیا۔ اس کو کنواں کیوں کہا جائے یہ سمجھو کہ اچھی خاصی باؤلی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کنویں میں نہایت نفیس قسم کی خوشبودار فیرنی بھری ہوئی ہے۔ جس پر چاندی کے ورق نہایت سلیقہ سے لگے ہوئے ہیں اور جس طرح عام طور پر کنوؤں میں کائی جم جاتی ہے اسی طرح اس کنویں میں بھی کائی جمی ہوئی تھی۔ مگر وہ کائی پستے اور بادام کی ہوائیوں کی تھی۔ منجھو مرحوم نے اس کنویں سے ایک سونے کا ڈول کھینچا اور اب جو میں اس فیرنی کو چکھتا ہوں تو روح تازہ ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ شکر میں لپیٹ کر چوپائی کھا گئے۔ بھائی ایسی کھیر تو میں نے کبھی خواب میں نہ دیکھی تھی۔ حد یہ ہے کہ اب تک زبان میٹھی ہے۔ خیر صاحب اس کنوئیں سے چل کر شربت کا آبشار دیکھا۔ پھر گاجر کے حلوہ کی دلدل دیکھی اور آخر میں گڑ کا پہاڑ دیکھا۔ مگر سچ پوچھو تو اس وقت حقہ کی کمی نہایت بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے منجھو مرحوم سے حقہ کا ذکر کیا، اس نے فوراً ہی اپنے جیب سے ایک طلائی نے نکال کر کہا۔ ”لو پیو۔“

میں نے کہا کہ ”آخر کیا پیوں؟ نہ حقہ نہ چلم تم بھی بڑے مسخرے ہو۔“

تو منجھو مرحوم نے نہایت متانت سے کہا۔ ”بھائی یہ حقہ ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ جنت ہے، یہاں آگ نہیں آسکتی۔ لہٰذا اس کی چلم تو ہے دوزخ میں اور نے آپ کے ہاتھ میں دوزخ کے فرشتے برابر چلم بھرتے رہتے ہیں۔ ذرا تم پی کر تو دیکھو۔“

اب جو میں اس نے کا ایک کش لیتا ہوں تو آپ سے کیا کہوں کہ میرا کیا حال ہوا۔ ایسا خمیرہ تو میں نے کبھی پیا کیا معنی کبھی گلستاں بوستاں میں بھی نہ دیکھا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ جیسے اس کی خوشبو میرے جسم کے ہر حصہ میں دوڑ گئی۔ میں دیر تک حقہ پیتا رہا۔ آخر مجھ کو خیال آیا اور میں نے منجھو مرحوم سے کہا کہ ”ایسا حقہ مجھ کو کہاں سے مل سکتا ہے؟“

منجھو نے کہا کہ ”یہ سب چیزیں جنت کے داروغہ سے مل سکتی ہیں۔“ اب تو مجھ کو بھی جنت کے داروغہ سے ملنے کا خیال پیدا ہوا اور میں سیدھا ان کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک عالیشان افیون کی عمارت دکھا کر منجھو مرحوم نے کہا۔

”یہ جنت کا کتب خانہ ہے۔ اس میں طلسم ہوشربا، الف لیلیٰ، قصہ گل بکاؤلی، قصہ طوطا مینا اور تمام ان کتابوں کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے جو افیونیوں کے ذوق کی سمجھی جاتی ہیں خصوصاً طلسم ہوشربا کی باقی دو سو پچاس جلدیں جو دنیا میں نایاب ہیں، کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ مگر مجھ کو تو اس وقت داروغۂ جنت سے ملنے کی جلدی تھی۔ لہٰذا کتب خانہ کی عمارت کو باہر ہی سے دیکھتا ہوا داروغۂ جنت کے دفتر پہونچ گیا۔ منجھو مرحوم کو باہر ہی چھوڑ کر میں خود دفتر میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں بظاہر تو کوئی نہیں ہے مگر میرے پہونچتے ہی ایک آواز آئی کہ ”آپ کا نام“ میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”میر جعفر ہے اس غلام کا نام“ پھر آواز آئی ”باپ کا نام“ میں نے حافظہ پر زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا تو گھبرا کر کہہ دیا۔ ”غلام کو یاد نہیں۔“

پھر آواز آئی ''پشہ......''

میں نے کہا۔ ''صرف افیونی ہے یہ ناچیز۔''

اس مرتبہ آواز ذرا تیز آئی کہ ''کیا تم میر جعفر قلعی گر ابن میر باقر ہو؟''

نہیں میں نے گھبرا کر کہا۔ ''ہرگز نہیں وہ تو میرا ہم محلّہ ایک غیر افیونی ہے۔''

اس کے جواب میں مجھ کو یہ خبر سنائی گئی کہ میری روح غلطی سے قبض کر لی گئی ہے۔ دراصل موت آئی تھی اس قلعی گر کی لہٰذا اب جو میں وہاں سے پھینکا جاتا ہوں تو اپنی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اور سب کہہ رہے تھے کہ ''میر صاحب مرے نہیں بلکہ پینک میں ہیں۔''

خاں صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اپنی اپنی تقدیر ہے بھائی۔ تم کو جیتے جی جنت مل گئی۔''

مرزا صاحب نے کہا۔ ''خیر بھئی معلوم یہ ہوا کہ جنت بھی ہے کام کی چیز۔

اگر میں لڑکی ہوتا

حضرت جگر مرادآبادی نے ایک عجیب شعر بہت خوب کہا ہے ؎

خدا گواہ جو ہم آپ کی جگہ ہوتے
محبتوں کے خزانے لٹا دیا کرتے

مگر خدا جانے یہ شعر کس دنیا کے متعلق ہے۔ اس لیے کہ ایک ہندوستانی عورت محبتوں کے خزانے کسی حالت میں لٹا ہی نہیں سکتی۔ ہندوستانی بہو بیٹیوں کے متعلق تو جب کبھی ہم غور کرتے ہیں، یہ شعر کچھ اس طرح ہمارے ذہن میں گونجنا شروع کر دیتا ہے کہ ؎

خدا گواہ جو ہم آپ کی جگہ ہوتے
تو ہم کو خود بھی یہی فکر ہے کہ کیا کرتے

یعنی اگر خدانخواستہ ہم اپنے والدین کے برخوردار سعادت آثار ہونے کے بجائے کہیں دختر نیک اختر واقع ہو گئے ہوتے تو عجیب مہمل زندگی ہوتی ہماری بھی۔ یہ خیال ان لڑکیوں یا ان عورتوں کے ذہن میں نہیں آ سکتا جو پیدائشی طور پر لڑکیاں یا عورتیں واقع ہوئی ہیں۔ مگر اس خیال اور اس خیال کی اہمیت کو لڑکی نہ بن سکنے والے لڑکے یعنی عورت بن کر نہ پیدا ہونے والے مرد ہی کچھ محسوس کر سکتے ہیں۔ کہ اگر وہ بجائے مرد بننے کے عورت یعنی بجائے لڑکا ہونے کے لڑکی بن جاتے تو کیا ہوتا۔ کم

سے کم ہم اپنی حالت کا اندازہ خود ہی کر سکتے ہیں۔ کہ جب کبھی ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے تو غور کرتے کرتے الجھ گئے ہیں۔ اُلجھنے کے بعد اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہوئی ہے۔ اور آخر کار کپڑے پھاڑ کر نکل بھاگنے کی حد تک پہونچ کر یہ خیال آیا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم تو مرد ہیں۔ ہم کو اس طرح پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حالانکہ اگر ہم واقعی لڑکی ہوتے تو اپنی اسی زندگی کے عادی ہو کر رہ جاتے اور لڑکی ہونا ہمارے نزدیک کوئی مصیبت نہ ہوتا۔ مگر لڑکا ہو کر لڑکی کی زندگی پر غور کرنا ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ نہایت بھیانک ہوتا ہے۔

میدانوں میں ہاکی اور کرکٹ کھیلنے والے لڑکے گھروں میں گڑیاں کھیلنے والی لڑکیوں کی زندگی کا تصور اس وقت تک کر ہی نہیں سکتے، جب تک کہ وہ ہماری طرح اس خیال کو اپنے اوپر طاری نہ کرلیں۔ کہ اگر ہم لڑکی ہوتے تو کیا ہوتا۔ ریشمی برقعہ پہن کر اونچی ایڑی کے جوتے کے ساتھ وحشی ہرنیوں کی سی چال کس نوجوان کو اچھی نہیں لگتی۔ زرق برق ساریوں میں سورج کی باریک کرن کی طرح تھرتھرانا کس لڑکے کو اچھا نہیں معلوم ہوتا؟ گھنگھور گھٹاؤں کی طرح کے بال کون مرد پسند نہیں کرتا؟ لیکن اگر یہی پسند آنے والی چیزیں ان پسند کرنے والے لڑکوں اور مردوں کے سامنے پیش کی جائیں۔ کہ اگر یہ برقعہ پسند ہے تو حاضر ہے۔ یہ اونچی ایڑی کا جوتا اچھا معلوم ہوتا ہے تو ہماری طرف سے قبول فرمایئے۔ یہ زرق برق ساری تو لے ہی لیجیے۔ اور ان گھنگھور گھٹاؤں کی طرح کے بالوں کو اپنے ہی سر اقدس کی زینت بنایئے تو ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ تمام لڑکے اور مرد سر پر پیر رکھ کر بھاگیں گے۔ اور ان ہی تمام پسندیدہ چیزوں کو اپنے لیے نہایت خوفناک سمجھیں گے۔ اس لیے کہ دراصل وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لیے نہیں بلکہ ایک عورت ہی کے لیے پسند کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان چیزوں کو قبول کرنے کے بعد خود ان کو اپنے متعلق عورت ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کانوں پر ہاتھ اور سر پر پیر رکھ کر بھاگتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ خواہ کیسے ہی بدصورت مرد کیوں نہ ہوں، مگر ان کو حسین سے حسین عورت بننا بھی گوارہ نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ اسی طرح عورتیں بھی مرد بننا پسند کرتی ہوں لیکن یہ افسوس تو ان کو ضرور ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے تو آخر مرد بن کر کیوں نہ پیدا ہوئے کہ زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرتے۔ یہ کیا کہ ایک طولانی موت کا نام زندگی رکھ چھوڑا ہے۔ اور خوش ہیں کہ زندہ تو ہیں۔ خیر صاحب ہم اس مبحث کو یہیں پر ختم کیے دیتے ہیں، ورنہ بہت سے حضرات کہیں گے کہ یہ شخص عورتوں کو شہ دے رہا ہے۔ حالانکہ مردوں کا یہ سمجھنا ہی مات کھا جانے کی علامت ہے۔

بہر حال ہم کو عرض کرنا ہے کہ اگر ہم لڑکی ہوتے تو کیا ہوتا۔ اس سلسلہ میں اپنی پیدائش سے لے کر تادم تحریر تمام واقعات اگر تفصیل کے ساتھ نہیں تو اجمال کے ساتھ ہم پیش کرنا چاہتے ہیں، تا کہ ہماری اس زندگی کا اندازہ آپ کو ہو سکے، جو بفضلہٖ مرد بن کر ہم کو بسر کرنا نہیں پڑی۔ لیکن اگر عورت پیدا ہو کر بسر کرنا پڑتی تو یہی ہوتا کہ جب ہماری پیدائش کی اطلاع والد صاحب کو ہوتی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے، تو وہ لڑکے کے منتظر والد صاحب دل میں تو یہی کہتے کہ ع

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

مگر زبان سے کہتے کہ ''اچھا بھائی پیدا ہوئی تو خدا نصیبہ ور کرے اور صاحبِ عمر۔'' اس کے بعد ان کی گردن کچھ جھک سی جاتی۔ اور یہ ہوتا گویا مجھ لڑکی کا خیر مقدم۔ اس کے بعد مجھ کو لڑکا یا لڑکی سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا بچہ سمجھ کر میرے والدین پالتے۔ یہاں تک کہ میں اس قابل ہو جاتی کہ پڑھنے بٹھائی جاؤں۔ لہٰذا میرے لیے ماسٹر صاحب نہیں بلکہ استانی جی مقرر ہوتیں اور میں اوڑھنی اوڑھ کر ان کے سامنے پڑھنے کو بیٹھا کرتی۔ حالانکہ میرے بھائی ننگے سر اپنے ماسٹر صاحب کے پاس

پڑھا کرتے۔ پڑھنے سے فارغ ہو کر میرے بھائی اچھل کود شروع کر دیتے لیکن اگر میں ذرا بھی دوڑتی تو اماں جان فوراً مجکو جھڑک دیتیں کہ “واہ یہ بھی کوئی لڑکیوں کا انداز ہے کہ لڑکی ذات ہو کر لونڈوں کی طرح اچھلتی پھرتی ہے موئی گھوڑی جیسے” میں کھسیانی ہو کر اور اپنا دل مار کر سٹ کر بیٹھ رہتی۔ میرے بھائی شکار کو جاتے اور میں گڑیاں کھیلتی۔ میرے بھائی فٹ بال کھیلتے اور میں ہنڈکلھیا پکاتی۔ میرے بھائیوں کو ورزش سکھائی جاتی اور مجھ کو سینا پرونا۔ میرے بھائی گھوڑوں پر سوار ہوتے اور میں پٹرے پر بیٹھ کر روٹی پکانا سیکھتی۔ میرے بھائی اپنی بائیسکلوں پر فراٹے بھرتے ہوئے اسکول جایا کرتے اور میں اسکول کی بند لاری میں گھٹ گھٹ کر اسکول جایا کرتی۔

میرے بھائی ابا جان کے ساتھ ان کے دوستوں کے یہاں جایا کرتے، اور اماں جان میری وجہ سے خود بھی کہیں نہ جاتیں کہ جوان جہاں لڑکی کو گھر میں کیسے چھوڑیں۔ اور سیانی لڑکی کو کسی کے یہاں لے کر کیوں کر جائیں۔ میرے بھائی اسکولوں سے نکل کر کالج میں داخل ہوتے اور میں اسکول ہی سے اٹھالی جاتی، کہ اب لڑکی ماشاءاللہ سیانی ہو گئی ہے، اب اسکول بھیجنا ٹھیک نہیں ہے۔ کالج میں داخل ہو کر میرے بھائی گھر چھوڑ کر بورڈنگ میں چلے جاتے اور اسکول چھوڑ کر میرے سر تمام گھر کا انتظام آ پڑتا۔ اور اماں جان صرف معمولی سی نگرانی کے لیے رہ جاتیں۔ یہاں تک کہ میری وہ عمر آ جاتی کہ ابا جان کو اور ابا جان سے بہت زیادہ اماں جان کو دن رات یہی فکر ہوتی کہ کیوں کر مجھ کو گھر سے نکالیں۔ ان کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام اسی فکر میں حرام ہو جاتا۔ وہ تو وہ آئے گئے سب ہی کو میری صورت دیکھ کر یہی فکر ہوتی کہ آخر میں اب تک اس گھر میں کیوں ہوں۔ مہترانی ہے تو اماں جان سے تقاضہ کر رہی ہے کہ “بیوی اب تو ہمارے ہماری بٹن کا بیاہ ہو جانا چاہئے۔” “دھوبن ہے تو اس کو یہی غم کھائے جاتا ہے کہ۔ “بی کی بات کہیں لگی یا نہیں؟” منہیارن ہے کہ چوڑیاں پہناتی جاتی

ہے اور یہی کہتی جاتی ہے کہ “اللہ رکھے یہی شادی کے دن ہیں۔ جوان جہان لڑکی کا بٹھائے رکھنا بھی تو ٹھیک نہیں۔” اور اماں جان ان تمام تذکروں پر اس طرح ٹھنڈی سانسیں بھرتیں کہ گویا واقعی تمام دنیا کے لڑکے رفتہ رفتہ ختم ہو گئے اور میں بیٹھی رہ گئی۔ میں رات کے سناٹے میں اپنے بستر پر لیٹ کر ابا جان اور اماں جان کی اسی معاملہ میں جھڑپ سنا کرتی کہ اماں جان نے رازدارانہ طریقہ پر پوچھا کیا سو گئے:-

ابا جان نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ “نہیں تو۔ ابھی سو جاتا کیا؟”

اماں جان نے کہا۔ “میں کہتی ہوں کہ آخر لڑکی کو کب تک کلیجہ سے لگائے بیٹھے رہو گے۔”

ابا جان نے جواب دیا۔ “تو آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا میں کسی راہ چلتے کے ہاتھ پکڑا دوں۔”

اماں جان نے کہا۔ “نہیں میں کہتی ہوں کہ تم کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہوئے ہو۔”

ابا جان نے جل کر کہا۔ “تو آپ ہی کانوں کا تیل نکال کر کوئی فکر کریں۔ مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں لڑکی کو جان بوجھ کسی گڑھے میں جھونک دوں۔”

اماں جان نے کہا۔ “آخر وہ تحصیلدار کے لڑکے کا کیا ہوا؟”

ابا جان نے کہا۔ “لا حول ولاقوۃ۔ اجی وہ سخت نالائق ہے۔ آوارہ گرد۔ سنا ہے کہ ناچنے گانے کا بھی شوق ہے۔”

اماں جان نے کہا۔ “اور وہ جو بھوپال سے نسبت آئی تھی۔”

ابا جان نے کہا۔ “جی ہاں ان حضرت کے متعلق معلوم ہوا کہ بھائی صاحب مرحوم کی عمر کے ہیں۔”

اماں جان نے کہا۔ “کیا سچ مچ عمر زیادہ ہے لڑکے کی؟”

اباجان نے کہا۔ ’’ہاں صاحب۔ وہ لڑکا نہیں ہے لڑکوں کا دادا ہے۔‘‘

اماجان نے کہا۔ ’’لڑکے اور لڑکی میں بیس برس کا فرق ہو تو خیر! مگر اس سے زیادہ نہیں۔‘‘

اباجان نے کہا۔ ’’تو آپ گویا مجھ سے بیس برس چھوٹی ہیں۔‘‘

اماں جان نے جل کر کہا۔ ’’اے ہٹو بھی! تمھارا کون ساذکر ہے یہاں۔ چلے وہاں سے بوڑھا چونچلا لے کے۔‘‘

اباجان نے کہا۔ ’’میرے خیال میں تم مجھ سے دوچار سال خود ہی بڑی ہوگی۔

اماں جان نے اور بھی جل کر کہا۔ ’’اور کیا ایسے ہی تو ننھے ہو چھنو لے۔‘‘

اباجان ہنس کر چپ ہو گئے ہوتے مگر اماں جان دیر تک ان بھوپال والے بڑے میاں کی تائید میں اباجان کو سمجھاتی رہتیں۔ یہاں تک کہ وہ دونوں سو جاتے۔ مگر میری نیند اُڑ جاتی کہ یا اللہ کیا میں اسی کھونسٹ کے پالے پڑوں گی، جس کے نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ تمام رات ان بڑے میاں کا خوفناک خیال ستاتا رہتا۔ اور اس حد تک میں پریشان ہو جاتی۔ کہ رونے کو دل چاہتا، مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہہ سکتی کہ للّٰہ مجھ کو اس ٹوٹی ہوئی قبر میں دفن نہ کرو۔ اگر واقعی وہ کمبخت اتنا ہی بوڑھا ہے تو اس موئے کے جسم سے تو کافور کی بو بھی آتی ہوگی۔ اور اس کے جسم پر لباس کفن معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر ہمارے خاندان کی بہو بیٹیاں ان معاملات میں گونگی اور بہری دونوں ہوتی ہیں۔ لہٰذا میں بھی کچھ نہ کہہ سکتی۔ البتہ نہایت رشک کے ساتھ اپنے بھائیوں کو دیکھتی کہ وہ نہایت آزادی کے ساتھ اپنی اپنی شادیوں کا ذکر کرتے اور اپنی دلہنوں کے لیے آزادی سے شرائط پیش کرتے۔ کہ صاحب پہلے لڑکی کو خود دیکھیں گے۔ اور صاحب پہلے لڑکی کی تصویر آنا چاہیے۔ وہ انگریزی بھی جانتی ہے یا نہیں؟ اس کے بال کتنے بڑے ہیں؟ اور اس کی آواز کیسی ہے؟ میں حسرت سے اپنے بھائیوں کی اس آزادی کو دیکھتی اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ اماں جان میرے بھائیوں کی اس بے باکی پر ہنس دیا کرتیں۔ لیکن اگر میری زبان سے ایک لفظ بھی میری شادی کے متعلق سن لیتیں تو گویا اپنی عزت آبرو کے جنازہ پر کہرام مچادیتیں۔ لہٰذا میں چپ رہتی خواہ وہ کسی کے ساتھ میری شادی کر دیتیں۔ البتہ دل ہی دل میں یہ فکر مجھ کو بھی پریشان رکھتی کہ دیکھئے میری قسمت میں کیا لکھا ہے اور میں کس کے حوالے کی جاتی ہوں؟ اگر کسی نسبت کا ذکر سنتی تو دل کو ایک کھوج سی ہوتی کہ یہ صاحب کون ہیں؟ اور کیا ہیں۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکتی۔ آخر کار ایک دن میں اباجان کو اماں جان سے یہ کہتا ہوا بھی سُن لیتی کہ:۔

’’میرے نزدیک یہ نسبت ہر طرح بہتر ہے۔ یہ دیکھو لڑکے کی تصویر ہے۔‘‘

اماں جان تصویر دیکھ کر کہتیں۔ ’’اے ہے! لڑکا دُبلا کتنا ہے۔ کہیں کوئی عارضہ تو نہیں ہے؟‘‘

اباجان کہتے۔ ’’لاحول ولاقوۃ۔ جو بات کہتی ہو ایسی ہی کہتی ہو۔ نہایت اچھی تندرستی ہے اس کی۔ شریف گھرانے کا ہے۔ روزگار سے لگا ہوا ہے۔ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ بہت سی کتابیں لکھ چکا ہے اور کافی مشہور آدمی ہے۔‘

اماں جان کہتیں کہ۔ ’’چشمہ تو دیکھو کیسا موٹا سا لگائے ہوئے ہے۔‘‘

اباجان جل کر کہتے۔ ’’توبہ ہے! یہ فضول باتیں کرو گی اور کوئی صاف بات نہ بتاؤ گی کہ ان کو جواب کیا دیا جائے۔‘‘

اماں جان کہتیں۔ ’’تو میں کیا بتاؤں؟ تم کو اگر اطمینان ہو تو بسم اللہ کرو۔‘‘

اباجان کہتے۔ ’’ہاں مجکو اطمینان ہے۔ لڑکا سمجھا بوجھا ہوا ہے اور ہر طرح مناسب ہے۔‘‘

اماں جان بھی راضی ہو جاتیں اور ابا جان تو گویا پہلے ہی سے رضامند ہوتے۔ مگر میں یعنی جس کا اصل معاملہ ہوتا وہ گویا کوئی چیز ہی نہیں۔ مگر مجکو قدرتی طور پر یہ فکر ہوتی کہ جن صاحب کے لیے میرا مالک ہو جانا طے کر دیا گیا ہے وہ آخر ہیں کون؟ میرا دل چاہتا کہ تصویر بھی دیکھوں مگر نہ دیکھ سکتی۔ آخر میری ہم جولیاں مجکو چھیڑ چھیڑ کر اور گدگدا کر ان صاحب سے غائبانہ طور پر متعارف کراتیں اور میں یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتی کہ خیر جو کچھ ہو اور وہ جیسے بھی ہوں مگر کم سے کم بھوپال والے بڑے میاں تو نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ میری شادی کے لیے دن اور تاریخ مقرر ہوتی۔ اور ایک دن شالباف میں مجھ کو لپیٹ کر بٹھا دیا جاتا۔ اور نکاح کے وکیل آ کر مجھ سے پوچھتے کہ۔ ’’میں نے اپنی وکالت میں تمھارا نکاح شوکت تھانوی ولد منشی صدیق احمد صاحب کے ساتھ بعوض پندرہ ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت کیا۔ تم کو منظور ہے؟‘‘ میں اس وقت کچھ بن بن کر اور کچھ واقعی سسکیاں لے لے کر روتی اور آخر کار تیسری مرتبہ نکاح کے وکیل کے جواب میں مجکو خفیف سا ’’ہوں‘‘ کہنا پڑتا اور یہیں سے میری دنیا بدل جاتی۔

اپنے نکاح کے بعد میں شوکت دلھن کہلاتی اور جیسی کچھ بھی میری زندگی ہوتی میں اسی میں خوش رہتی۔ میرے مزاح نگار شوہر مجھ کو اپنا موضوع مزاح بناتے اور میں اس بات پر ان سے لڑتی۔ آخر کار تھوڑے دنوں کے بعد اس بات کی عادی ہو جاتی۔ میرے دو بچے ہوتے جو مجکو اپنی تتلی زبان سے امّی جان کہتے۔ اور میں ان کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی۔ مگر الحمد اللہ کہ میں لڑکی نہیں لڑکا ہوں۔ عورت نہیں مرد ہوں۔ شوکت دلھن نہیں شوکت تھانوی۔

تکلفات

تھانوی ہونا دوسری بات ہے مگر یہ خاکسار حاضر ہوا ہے اسی لکھنؤ سے جہاں ’’پہلے آپ‘‘ اور ’’نہیں حضت پہلے آپ‘‘ کے تکلفات میں ٹرین چھوڑ دی جاتی ہے مگر وضع نہیں چھوڑی جاتی۔ اب ذرا اس خاکسار کا لکھنؤ سے حاضر ہونا ملاحظہ فرمایئے اور گنتی کے پندرہ منٹ ریڈیو پر مضمون پڑھنے کے لیے دیکھئے۔ انصاف سے کہیے گا کہ ایک لکھنؤ سے آنے والا اس پندرہ منٹ میں کتنی دیر اپنی شیروانی کا دامن درست کر کے ایک مناسب زاویہ سے بیٹھنے کی کوشش کرے گا کتنی ریشمیں رومال سے لبوں کو صاف کرے گا۔ کتنی دیر کھنکھار کر آواز کے سر درست کریگا۔ کتنی دیر شرمائے گا اور کتنی دیر اس کا انتظار کرے گا کہ سامعین ’’ارشاد‘‘ کہہ کر تقاضہ کریں۔ یہاں کل پندرہ منٹ ہیں حالانکہ یقین جانئے کہ ان میں سے ہر ادا کے لیے فرداً فرداً پندرہ منٹ کی ضرورت ہے اور اس کے بعد بھی یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ مضمون سنایا بھی جائے۔ اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ خاکسار لکھنؤ سے حاضر ہونے کی رعایت سے محض ناسازی طبع۔ یعنی زکام، نزلہ، گلوگرفتگی، اختلاج قلب، دوران سر وغیرہ وغیرہ تمام ممکن اور ناممکن امراض کو بطور عذر پیش کر کے معذرت چاہے۔ اور پھر جب تمام ہندوستان کے ریڈیو نواز بصیغہ غائب اور ریڈیو اسٹیشن دہلی والے بصیغہ حاضر اس خاکسار سے اصرار کریں تو یہ کم ترین گویا مجبور ہو کر محض تعمیل ارشاد میں ایک شعر حاصل مضمون

روانی کے ساتھ سنا جائے۔ مگر ان تمام مراحل کو طے کرنے کے لیے منٹوں کی نہیں بلکہ گھنٹوں کی ضرورت ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ گھڑی دیکھتے رہو۔ جیسے ہی چھوٹی سوئی آٹھ پر اور بڑی بارہ پر پہونچے فوراً شروع کردو اپنا مضمون جو ایک ایک سکنڈ کے حساب سے ٹھیک اس وقت ختم ہو جائے جب کہ بڑی سوئی تین پر پہونچ جائے۔ گویا ہم لکھنؤ سے آنے والے ایک آدمی نہیں ہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ سے آنے والی کوئی ٹائم پیس ہیں۔

-x-x-

ممکن ہے کہ آپ کو اس باقاعدگی اور تہذیب کے مقابلہ میں شیخ ابراہیم، ذوقؔ سے اتفاق ہو جن کا نظریہ یہ تھا کہ ؎

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

مگر غور کیجئے تو یہ تعلیم سوائے خود غرضی کے اور کچھ نہیں سکھاتی۔ یقیناً آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے مگر جس کے ساتھ تکلف نہیں کرتے اس غریب کی کیا گت بناتے ہیں اس پر بھی تو غور کرنا چاہیے۔ یہ کیا کہ محض اپنی تکلیف دور کرنے کی تو ایک راہ نکال لی اس کے بعد تمام دنیا گئی جہنم میں۔ لیکن لکھنؤ کا تکلف، ایثار، قربانی، نفس کشی اور اسی قسم کی خدا جانے کتنی خوبیاں سکھاتا ہے۔ اس تکلف کے ماتحت انسان ہر مصیبت خود ہی جھیل لے جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بے تکلف بن کر دوسروں کے لیے عذاب بن جائے۔ مارے بے تکلفی کے بغیر کسی اطلاع کے رات کو ٹھیک دس بجے نازل ہو گئے کسی دوست کے یہاں اور مان نہ مان میں تیرا مہمان کے اصول پر عمل کرتے ہوئے طلب کیا اُس سے کھانا معہ چند فرمائشات کے جن کی تعمیل کے لیے خواہ وہ چوری کرے یا بال بچوں کا پیٹ کاٹے، کسی سے قرض لائے یا خود پیٹ پر پتھر

باندھ کر سو رہے مگر آپ کی بلا سے۔ آپ کو اپنے کام سے کام۔ ایسے مہمان کے لیے میزبان کے دل کی گہرائیوں سے جو بددعائیں نکلتی ہیں، وہ قبول ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں، مگر شیخ ابراہیم ذوقؔ کی روح ضرور شرمندہ ہوتی ہوگی کہ وہ کیسا غلط نظریہ قائم کر گئے ہیں۔ ایک لکھنوی صاحب تکلف کے لیے اس قسم کی بے تکلفی قطعاً ناممکن ہے۔ وہ اگر ناوقت کسی شہر میں پہونچے گا بھی تو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر شٹنگ کرکے دیوار پر چسپاں ٹائم ٹیبل کو بار بار رواں اور ہجے لگا کر پڑھ کر، میر تقی میر کی غزلیں گنگنا کر وقت کاٹ دے گا اور صبح شریف آدمیوں کی طرح مہمان بن کر میزبان کے دروازہ پر پہونچے گا۔ اور اس وقت بھی یہ عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ جب میزبان ناشتہ چنے گا تو یہ مرد معقول جو بلا مبالغہ دو تین فاقوں سے ہوگا یہی کہے گا کہ حضت میں تو ناشتہ کرکے حاضر ہوا ہوں۔ اب یہ اور بات ہے کہ قسما قسمی اور اصرار سے مجبور ہو کر اسی ناشتہ کو اس صفائی سے تناول فرما جائے کہ صرف میزبان کو تکلفاً چھوڑ دے۔

-x-x-

ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کے تکلف کو دنیا نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس کا مذاق اڑا کر اس کے فوائد کو نظر انداز کر دیا، ورنہ یہ تکلف اُن تمام سیاسی، ہندوستانی اور بین الاقوامی مسائل کا واحد حل ثابت ہوتا جو آج کل مفکرین عالم اور مدبرین وقت کا دماغ چرخ کیے ہوئے ہیں۔ بے تکلفی اور اکھڑپن ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ تخفیف اور توسیع اسلحہ کی گتھی کسی طرح سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہندوستان کے لیے جدید دستور کی بھی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ اور اس دستور کے لیے ہڑتال کی بھی ضرورت ہے۔ اسپین میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور چین و جاپان میں الگ کشیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام دنیا میں ایک آگ لگی ہوئی ہے اور امن و سکون کا کہیں پتہ نہیں۔ کاش تکلف کو اس طرح نظر انداز نہ کیا گیا ہوتا اور بجائے اس کے کہ تخفیف

اور توسیع اسلحہ کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں یہ ہوتا کہ جرمنی برطانیہ کو لکھتا کہ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں ایک ہزار توپیں بنانا چاہتا ہوں۔ اس کے جواب میں برطانیہ پانچ سو توپیں معہ اس مضمون کے خط کے بھیج دیتا کہ آپ نے غیریت برتی اور بجائے برطانیہ سے توپیں طلب کرنے کے خود توپیں بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ بہرحال اس وقت برطانیہ کے پاس پانچ سو توپیں تیار تھیں جو ارسال خدمت ہیں۔ باقی انشااللہ بہت جلد تیار کرا کے روانہ کی جائیں گی۔ مگر آپ کو ہمارے سر کی قسم کہ ان کو اپنی ہی چیز سمجھ کر قبول فرمائیگا۔ اور آئندہ بھی خدمات لائقہ سے یاد فرماتے رہیے گا۔ اس کے جواب میں جرمنی کی طرف سے ان توپوں کی قیمت روانہ ہوتی۔ اور پھر مسٹر بالڈون اور ہٹلر کے درمیان اس قسم کے بحری پیغامات کا سلسلہ شروع ہو جاتا کہ "نہیں حضت یہ نہ ہوگا۔"

"واللہ بھائی بالڈون۔ آپ کو یہ دام تو قبول ہی کرنا پڑیں گے۔"

"آپ کے سرِ عزیز کی قسم ہٹلر صاحب۔ یہ قیامت تک نہ ہوگا۔"

"اے حضت آپ کی توپیں ہماری تھیں تو ہمارا روپیہ آپ کا ہے۔"

"یہ صحیح ہے مگر آپ غیریت بَرت رہے ہیں۔"

"یہ رقم اور وہ توپیں سب آپ پر نچھاور ہیں۔"

"اس رقم کو واپس کر کے دل شکنی نہ فرمایئے۔"

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ آئندہ کوئی فرمائش نہ ہو۔"

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ فرمائش غیروں میں ہوتی ہے۔ یہاں جو کچھ ہے آپ کا ہے۔"

"تو پھر آپ کو ہمارے سر کی قسم اس روپیہ کو بھی اپنا ہی سمجھئے۔"

"اچھا آپ نے دیدیا ہم نے پالیا۔ اب یہ ہماری طرف سے جرمن قوم کے

بچوں کو مٹھائی کے لیے دیدیجیے۔"

"قسم ہے ہمارے قومی جھنڈے کی جانِ عزیز کی کہ یہ نہ ہوگا۔"

"آپ تو واللہ مجبور کر رہے ہیں۔"

"اچھا تو اس کے معاوضہ میں نہ سہی تحفتاً دو چار سو ہوائی جہاز ہی قبول کر لیجیے۔"

"اس کی بھلا کیا ضرورت ہے۔"

"ضرورت نہیں ہماری خوشی ہے۔"

"آپ کی خوشی ہے تو اچھا یہی سہی۔"

اب آپ ہی بتایئے کہ اس قسم کے رواسم اور ان تعلقات کے بعد تخفیف یا توسیع اسلحہ بیکار نہیں تو اور کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس ناممکن بات کا ممکن ہونا فرض کر سکتے ہیں کہ شاید جنگ چھڑ جاتی۔ مگر جنگ میں بھی اس تکلف کی کارفرمائی جس حد تک مفید ہو سکتی ہے اس کا تصور بھی بے تکلف دنیا نہیں کر سکتی۔ جنگ اوّل تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہو بھی گئی ہوتی تو دونوں حریف ایک دوسرے کے مقابلہ پر برسوں صف آرا کھڑے رہتے اور حملہ کے سلسلہ میں دونوں طرف سے یہی اصرار ہوتا کہ "پہلے آپ" اور "نہیں حضت پہلے آپ۔"

-x-x-

رونا تو آتا ہے اس گہوارۂ تکلف ہندوستان پر۔ آج یہاں بھی تکلف کا نام ونشان نہیں ہے۔ کہیں جدید دستور کی ضرورت ہے اور کہیں جدید دستور کے لیے ہڑتال کی ضرورت۔ کہیں حقوق کا سوال ہے اور کہیں۔ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

حالانکہ اگر غور کیجیے تو تکلف کے نقطۂ نظر سے ہندوستانیوں کا حقوق طلب کرنا

ہی نہایت چھوٹی اور گری ہوئی بات ہے۔ ہمارے بزرگ اگر اپنی کوئی چیز کسی کو دیتے تھے تو اس طرح سے کہ ایک ہاتھ سے وہ چیز دی اور دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوئی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ مرتے دم تک پھر اس چیز کا نام تک زبان پر نہ آتا تھا اس کو واپس مانگنا یا اس کا معاوضہ لینا تو درکنار۔ خواہ پھر فاقوں پر نوبت پہونچ جائے یا چیتھڑے لگ جائیں مگر جان کے ساتھ آن نہیں جا سکتی تھی۔ اور ایک آج کل کا زمانہ ہے کہ سرکار کو جو ہندوستان دیا تھا اسی کو نہایت فخر کے ساتھ طلب کیا جا رہا ہے۔ نہ ہوئے یہ کانگریس والے لکھنوی ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اگر سرکار خود بھی ہندوستان واپس دینا چاہتی تو یہی کہا جاتا کہ کیوں سرکار اب یوں بھی ذلیل کیا جائے گا ہم کو۔ واللہ اس قدر ذلیل تو نہ کیجئے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اب کسی قابل نہیں ہیں مگر اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ اپنی دی ہوئی چیز واپس لیں۔ کاش ہم اس قابل ہوتے ایسے ایسے پچاس ہندوستان آپ پر قربان کر دیتے مگر کیا کہیں ع

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہندوستان کے سلسلے میں اپنا پرایا کیا؟ آخر ہم خود کس کے ہیں؟ یقین جانئے کہ آپ کے غلام ہیں اور آپ ہیں کہ ہم ہی سے یہ غیریت برت رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شریفانہ تکلف کے جواب میں سرکار کی طرف سے بھی کوئی بخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب ہندوستان ہی نے تکلف چھوڑ دیا ہے تو دوسروں کا کیا سوال۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقوق کے سلسلہ میں اعداد و شمار اور فیصدی تک کے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ پہلے ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو حساب دوستاں در دل کہکر ٹال دیا جاتا تھا۔ اور حد یہ ہے کہ اسی چھچھور پن سے بچنے کے لیے اگلے وقتوں کے لوگ دس سے زیادہ گنتی ہی نہیں جانتے تھے۔ اور جس کو آج کل گیارہ کہا جاتا ہے اس کو وہ بھولے بھالے شرفاء دس کے اوپر ایک کہا کرتے تھے۔ اور امن و سکون کی نہایت شریفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ حقوق نیابت کا سوال تھا نہ مشترکہ اور جداگانہ انتخاب کی کوئی بحث۔ نہ مسجد اور باجہ کا سوال تھا نہ صوبجاتی اور مرکزی آزادی کا کوئی جھگڑا۔ نہ انتخابات کا جھگڑا تھا نہ الیکشن بازی۔ بلکہ اس قسم کے تمام حوصلے نہایت غیر مضرت رساں طریقہ پر بیٹر بازی سے پورے کر لیے جاتے تھے۔ آپ نے بیٹر بازی کا مضحکہ اڑایا مگر اس انسانوں کی پالی یعنی الیکشن پر غور نہ کیا کہ یہ کیا ہے۔ بیٹر کا کیا وہ تو ایک ادنیٰ سا جانور تھا۔ فرض کر لیجئے کہ بھاگ گیا تو بھگا کہلایا اور زخمی ہوا تو چھتا کہا گیا۔ مگر اس دَور ارتقاء میں یہ رجعت قہقہری ملاحظہ ہو کہ بیٹروں کی جگہ انسان نے لے لی ہے۔ اچھے دل برے ہوتے ہیں۔ بیٹر چھے نہیں ہوتے بلکہ انسانوں میں سر پھٹول ہوتی ہے۔ اور اسی پر سب کو بڑا ناز ہے۔ لکھنؤ کا تکلف تو ایک ڈھکوسلا تھا مگر یہ تمام باتیں آخر کیا ہیں؟

-x-x-

خیر یہ تمام باتیں تو اس لیے عرض کر دیں کہ بات میں بات پیدا ہو گئی تھی اور مقطع میں نہیں بلکہ مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات پیدا ہو گئی تھی جس سے مقصود ترک مبحث نہیں بلکہ محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ تکلفات کو چھوڑنے والے کس حد تک غلط راستہ پر ہیں۔ لیکن ایک لکھنؤ سے حاضر ہونے والے کے لیے یہ کس قدر دقت کی بات ہے کہ وہ اس روایتی تکلف کو یک لخت نظرِ انداز کر دے اور گھڑی کی سوئی کے اشاروں پر عمل پیرا ہو کر مضمون سنانا شروع کر دے۔ پھر لطف یہ کہ سنائے تو کس کو سنائے؟ ماحول یہ ہے کہ ایک تنہا کمرہ ہے۔ جس میں بیٹھے ہوئے مضون پڑھ رہے ہیں بہ آواز بلند۔ یہ سچ ہے کہ ع

ساری دنیا گوش بر آواز ہے

مگر بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قید تنہائی میں باغیانہ تقریر کرنے کی مشق

کرر ہے ہیں یا در و دیوار سے باتیں ہو رہی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جب ہم سامعین سے سمع خراشی کی معذرت نہ چاہیں اور سامعین ہر جملہ پر نہ سہی جا بجا مکرر ارشاد نہ کہیں تو سنانے والے کا کیا خاک دل لگے لگا۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ ہم بالکل آلہ نشر الصوت کے رحم وکرم پر ہیں۔ اور آلہ نشر الصوت سے زیادہ ہندوستان کی موسمی حالت پر ہمارے اس مضمون کی تقریر کا انحصار ہے۔ فرض کر لیجیے کہ کہیں بادل گرج رہا ہے تو سننے والے یہی کہیں گے کہ سخت بدتمیز ہے یہ شخص بھی۔ مضمون سناتے ہوئے اس قدر واضح قسم کی ڈکار لیتا ہے۔ بلکہ اکثر حضرات کو تو یہ محسوس ہوگا کہ مضمون سناتے سناتے اس خاکسار پر چھت پھٹ پڑی ہے یا یہ خاکسار معہ کرسی اور میز کے الٹ گیا ہے۔ بہر صورت خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایک مضمون سنانے والے کی کیا کیا گت بنتی ہوگی۔ مگر یہ تمام باتیں اگر مقدرات سے وابستہ سمجھ لی جائیں تو بھی ریڈیو والوں کو اس کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے کہ ایک پنجابی اور ایک بنگالی ایک سرحدی اور ایک لکھنوی، سب کے لیے پندرہ منٹ کی قید تو ایک قسم کی زیادتی سی ہے نا۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اسی تمہید میں مضمون سے قبل پندرہ منٹ ختم۔

اگر میں بادشاہ ہوتا

رعایا کے دماغ کی خرابی یہی ہے کہ وہ اپنے بادشاہ ہو جانے کا خیال ذہن میں لائے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ بات ایک بادشاہ کے سوچنے کی نہیں ہو سکتی کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ بات تو وہی سوچ سکتا ہے جو بادشاہ نہ ہو اور چونکہ ہم بادشاہ نہیں ہیں لہٰذا اکثر فرصت کے اوقات میں یا بستر پر لیٹ کر سونے سے قبل غنودگی کے عالم میں یہ خیال ذہن میں آیا کرتا ہے کہ ہم بادشاہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ اس کے علاوہ اکثر بادشاہوں کے مقبرے دیکھ کر بھی خیال پیدا ہوا ہے یا اس قسم کے خیالات ذہن میں آنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب پیٹ بھر کر کھانا مل چکا ہو اور دوسرے وقت کے متعلق یہ علم ہو جائے کہ گھر میں جنس موجود ہے۔ یا بیوی اپنے میکے جا چکی ہوں اور ضروریات زندگی کی یاد دہانی کرانے والا کوئی موجود نہ ہو۔ اس قسم کے تمام مواقع پر انسان یا تو گنگناتے گنگناتے شعر کہنے لگتا ہے یا کوئی نیا راگ دریافت کرتا ہے۔ اور اگر بالکل ہی خالی الذہن ہوا تو پھر یہی غور کرتا ہے کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اس غور وفکر میں اس قدر منہمک ہوتا ہے آخر کار اس کو نیند آ جاتی ہے۔ ورنہ وہ پاگل ہو کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دے اور پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔

معلوم نہیں کہ اس قسم کے خیالات پاگل ہو جانے کی علامت ہوتے ہیں یا اہل ہوش پر بھی اس قسم کے جنون کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو مگر ہم کو

اعتراف ہے کہ ہم ایک مرتبہ سے زیادہ اس بات پر غور کر چکے ہیں کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ اور ہر مرتبہ اس خیال کو بالکل نئی صورت اختیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مثلاً کبھی تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے ہیں اور تھرڈ کلاس کی کشمکش میں تمام رات اس طرح بسر کرنا پڑی کہ اپنے متعلق یہ فیصلہ کر سکیں کہ ہم آدمی ہیں یا کسی کے اسباب۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ ہماری بھی کیا زندگی ہے۔ اور ہم میں اور ہماری گٹھڑی میں کیا فرق ہے۔ وہ بھی رکھی ہوئی ہے اور ہم بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ہم یقیناً آدمی نہیں بلکہ اسباب ہیں۔ اگر آدمی ہوتے تو بجائے تھرڈ کلاس کے، آدمیوں کی طرح سکنڈ کلاس میں سفر کرتے، ٹانگیں پھیلا کر سوتے، پنکھے کے فراٹوں سے ہوا لیتے اور لچکدار گدار یل کی ہر جنبش کے ساتھ ہم کو پالنے کا لطف دیتا۔ یا اگر اور بڑے آدمی ہوتے تو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے اوا پنے برتھ کو گھسیٹ کر چار پائی بنا لیتے پھر نہ تو اُنگھنے کی ضرورت ہوتی نہ گھٹنوں کے درمیان سر کے غائب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا۔ اور نہ اس کا خطرہ کہ اگر ہم اپنی جگہ سے ہلے تو یہ جگہ بھی ہاتھ سے جائے گی۔ بلکہ فرسٹ کلاس میں تو اس قدر کافی جگہ تھی کہ خواہ ہم ایک ہی برتھ پر سوئیں خواہ اس قدر پھیل کر سوئیں کہ ایک برتھ پر ہاتھ سو رہا ہے تو دوسرے پر ٹانگیں تیسرے پر سر ہے تو چوتھے پر کچھ مختصر یہ کہ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ حد یہ ہے کہ رات کو تھرڈ کلاس کی طرح ٹکٹ چیکر بھی ہمارا گھٹنا ہلا کر ٹکٹ طلب نہیں کر سکتا بلکہ وہ رات کو ہمارے درجہ میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا کہ مبادا ہماری فرسٹ کلاس نیند میں کوئی خلل نہ واقع ہو جائے۔ اور اصل آدمی تو وہ ہوتے ہیں جن کے لیے ٹرین میں خاص سیلون لگائے جاتے ہیں۔ اور وہ سیلون کب ہوتے ہیں اچھا خاصہ دولت خانہ ہوتے ہیں۔ رہ گیا گورنر کا اسپیشل یا وئسرائے کی خاص گاڑی اس کا تو خیر پوچھنا ہی کیا۔ اگر ایسی گاڑیوں میں سفر کرنے کا موقع ملے تو ہم شاید اپنے گھر پر رہنا ہی چھوڑ دیں۔ اور ہر وقت اسپشل ٹرین میں بیٹھے اِدھر اُدھر پھرا کریں۔ بادشاہ سلامت کی گاڑی اس سے بھی زیادہ پُر تکلف ہوتی ہوگی۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو یہ پر تکلف گاڑی ہم کو بھی ملتی اور ہم اس شان کے ساتھ سفر کرتے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے۔ ہم خاص طور پر اپنی گاڑی نہایت اعلیٰ درجہ کی بنواتے۔ اس میں ہمارے سونے کا کمرہ علیحدہ ہوتا جس میں سونے کی مسہری پہ ریشمی پردے پڑے ہوتے اور مخملی بستر بجائے خود خواب آور ہوتا۔ یہ بستر ایسا ہوتا کہ اس کو کھولنے اور باندھنے کی زحمت اٹھانا نہ پڑتی۔ غسل خانہ الگ ہوتا اور دفتر کا کمرہ الگ۔ ڈرائنگ روم بھی ہوتا اور تاش کھیلنے کا کمرہ بھی مختصر۔ یہ کہ اس ٹرین میں ہر وہ چیز ہوتی جو ایک انسان کے ذہن میں آسکتی ہے۔ پیانو، ریڈیو اور بائیسکوپ تک اس ٹرین میں ہمارے لیے موجود ہوتا۔ اور ہم غربت میں بھی گویا گھر ہی پر ہوتے یعنی ریل کیا ہوتی گویا محل کے پیر لگ جاتے اور وہی ہمارے اشاروں پر دوڑتے ہوئے نظر آتے۔ اس قسم کے خیالات کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوتا ہے جب کہ ٹرین کسی اسٹیشن پر ٹھہرے اور بہت سے دیہاتی لٹھ بند، یا کسی میلے سے بھاگتے ہوئے مویشی نما انسان، یا کچھ گھبرائے ہوئے براتی، یا بے شمار ماڑواڑی معہ اہل وعیال اس تھرڈ کلاس پر یکا یک حملہ کرتے ہیں اور ان کو رہ رہ کر سمجھانا پڑتا ہے کہ بھائی تم کس چیز پر بیٹھ رہے ہو، وہ کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں بلکہ ہم ہیں یعنی ہمارا سر ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ سر ہی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس تمام شاہی طلسم خیال کو توڑ کر صرف یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو اس تھرڈ کلاس میں سفر نہ کرتے۔

اپنے بادشاہ نہ ہو سکنے کا احساس اس وقت بھی نہایت شدت کے ساتھ ہوتا ہے جب ہم اپنے کسی عزیز کی ناگہانی علالت کا حال سن کر حد درجہ بدحواسی کے ساتھ بائیسکل پر بھاگے ہوئے جا رہے ہوں۔ اور راستہ میں کانسٹبل ہم کو روک کر

نہایت بے محل طریقہ پر ہمارا نام، ولدیت اور پتہ دریافت کرنا شروع کر دے۔ اور اس کے بعد بائیسکل کی ولدیت یعنی نمبر بھی ہم ہی سے پوچھے۔ کانسٹبل کے اس طرز عمل کو قانونی زبان میں چالان اور غیر قانونی میں بداخلاقی کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم کو بائیسکل میں لیمپ لگانا چاہیے۔ اگر اور ہم بغیر لیمپ کے دیکھے جائیں تو کانسٹبل کا فرض ہے کہ وہ ہمارا نمبر اور بائیسکل کی ولدیت نوٹ کر لے اور چالان کر دے۔ مگر اس قسم کے مواقع پر اکثر قدرتی طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو یہ برا وقت دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ اوّل تو بادشاہ ہونے کی صورت میں ہم کو اسی کی ضرورت نہ ہوتی کہ ہم اپنے کسی بیمار عزیز کی عیادت کو جائیں۔ بلکہ تمام بیمار عزیز خود اپنی علالت کو بھول کر ہماری مزاج پرسی کو آیا کرتے۔ لیکن فرض کر لیجیے کہ ہم کو جانا بھی پڑتا تو ہم اس شان سے جاتے کہ ہمارے لیے تمام راستہ کی سڑکیں پہلے سے بند ہوتیں۔ اور ان پر پہرہ ہوتا۔ ہماری سواری نکلنے سے قبل ان تمام پہرہ والوں کا دم نکلتا رہتا اور جس وقت ہمارا شاہی موٹر سنسناتا ہوا نکل جاتا۔ اس وقت سب کی جان میں جان آتی۔ خیر یہ تمام باتیں تو عام طور پر بادشاہوں کے لیے ہوا ہی کرتی ہیں۔ لیکن اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ہمارا انتظام ہی دوسرا ہوتا۔ مثلاً ہماری سواری کی شان یہ ہوتی کہ جس سڑک سے ہم گذرنے والے ہوتے۔ اس پر تمام دن کیوڑا اور گلاب چھڑکا جاتا۔ اس کے بعد تمام سڑک پر سچے ستارے اور سچے موتی بچھا دیئے جاتے۔ اور زمین پر تاروں بھری رات کا گمان ہوتا۔ تمام راستہ میں دورویہ بیلہ چمیلی اور موتیے کے گجروں کی زنجیریں کھینچ دی جاتیں اور راستہ میں جابجا خوشبو دار پھولوں کے متعدد پھاٹک بنائے جاتے۔ تماشائیوں کو سواری دیکھنے کی عام اجازت ہوتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ موسم کے اعتبار سے سرکاری طور پر مقرر کردہ لباس میں صف بہ صف دورویہ کھڑے ہوں۔ اور ان میں کوئی بدصورت مرد یا عورت ہرگز نہ ہوتا کہ جہاں پناہ کی نظر ذرا بھی مجروح نہ ہونے پائے۔ البتہ کبھی کبھی جہان پناہ یعنی ہم اگر کوئی تفریحی پروگرام بناتے تو اس میں رعایا کو دلچسپی لینے کا یقیناً حق دیتے۔ مثلاً قصر شاہی سے یہ اعلان کر دیا جاتا کہ آج جہاں پناہ اور ملکہ معظمہ میں لباس تبدیل ہو گیا ہے۔ چنانچہ حضور خداوند نعمت ملکہ معظمہ کے لباس میں ہوں گے۔ اور ملکہ معظمہ جہاں پناہ کے لباس میں لہٰذا رعایا کو حکم دیا جاتا ہے کہ تمام مرد عورتوں کے لباس میں اور تمام عورتیں مردوں کے لباس میں ٹھیک پانچ بجے قصر شاہی کے سامنے جمع ہوں اور اپنے بادشاہ کی دلچسپی میں حصہ لیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ پروگرام کس قدر دلچسپ ہوتا۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ صرف بادشاہ ہی کے لیے دلچسپ نہ ہوتا۔ بلکہ رعایا بھی اس دلچسپی میں برابر کی حصہ دار ہوتی۔ ہماری فطرت سے یہ بات یقیناً بعید تھی۔ کہ ہم بادشاہ ہوتے تو سنجیدہ بنے ہوئے بس تخت پر بیٹھے رہتے ...... بلکہ ہم تو دن رات اسی فکر میں رہتے کہ اب کیا کیا جائے اور کس صورت سے اپنے لمحات کو دلچسپ بنایا جائے۔ مثلاً کبھی فرمان شاہی یہ نافذ کر دیا جاتا کہ دربار عام میں تمام درباری اپنے ہمراہ ایک ایک بندر لائیں مگر واضح رہے کہ ان بندروں کی وجہ سے کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ جو آداب دربار کے خلاف ہو اور ہر درباری باوجود ان بندروں کے آداب شاہی اور اپنی سنجیدگی کا پورا خیال رکھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو کسی درباری کی مجال ہو نہیں سکتی کہ وہ شاہی فرمان کی تعمیل نہ کرے۔ لیکن اس فرمان کی تعمیل میں جس قدر مشکل ہو سکتی ہے اس کو وہی حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں جن کی نظر سے کوئی سنجیدہ انسان اور کوئی غیر سنجیدہ بندر گذرا ہے۔ اوّل تو بندر کو اپنے ساتھ رکھنا ہی کمال ہے اور بڑے بڑے بہادر اس قسم کی جسارت نہیں کر سکتے لیکن جب بندر کو ساتھ رکھنا اس طرح موت اور زندگی کا سوال

بن جائے تو سنجیدہ سے سنجیدہ انسان کے لیے دشوار بھی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھ سکے۔ اوّل تو وہ خود ہی نہایت مضحک ہو کر رہ جائے گا۔ دوسرے اس کو سنجیدہ بننے کی کوششیں نہایت مضحک بنا دیں گی۔ بہر حال اس فرمان کو نافذ کرنے کے بعد ہم ایسا تماشا دیکھتے جو لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ہمارا ایک سے ایک قابل وزیر ایک سے ایک خونخوار صورت کا فوجی افسر اور ایک سے ایک عالی مرتبہ رئیس دربار میں اپنے اپنے بندروں کے ساتھ جب داخل ہوتا۔ تو ہمارے لیے ہنسی کا روکنا دشوار ہو جاتا۔ پھر لطف یہ ہوتا کہ وہ بندر اپنے اپنے مالک کی جوگت بناتے وہ بھی قابل دید ہوتی۔ اور ایک درباری کا بندر جب دوسرے درباری پر یا اس کے بندر پر حملہ کرتا وہ منظر ہمارے عہد حکومت کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے والا ہوتا۔ اور اس دربار کو مورخ کبھی نظر انداز نہ کر سکتا۔ مختصر یہ کہ ہمارے دربار میں آئے دن اس قسم کے تماشے ہوتے رہتے اور یہ معلوم ہوتا کہ واقعی شاہی دربار ہے۔ یہ نہیں کہ بس دربار میں ہر وقت یہی بحث ہوا کرے کہ رعایا کو کس طرح فائدہ پہونچایا جائے اور رعایا کی تکلیف کو کس طرح دور کیا جائے۔ یہ کام دراصل بادشاہ کا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لیے جب بادشاہ نے الگ الگ محکمے کھول دیے ہیں تو خود بادشاہ کو ان معاملات میں اپنا دماغ پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی غیر ملک اگر حملہ کر رہا ہے تو اس کو محکمہ جنگ جانے بادشاہ سے کیا مطلب؟ رعایا کو کوئی تکلیف ہے تو بادشاہ سے کیا؟ ان شکایات کو سننے اور رفع کرنے کے لیے بادشاہ نے حاکم مقرر کر دیئے ہیں وہ خود ہی سب کریں گے۔ بادشاہ تو صرف اس لیے ہوتا ہے کہ بادشاہی کرے اور بادشاہی ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان مزے کرے۔ لہٰذا ہم بھی مزے کرتے اور جی کھول کر مزے کرتے اور ایک خاص محکمہ محض اس لیے ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کے لیے لطف زندگی حاصل کرنے کی نئی نئی صورتیں ایجاد کرتا رہے۔ البتہ اگر ہم کو کبھی اسی میں دلچسپی ہوتی کہ ہم کبھی تقریباً حکومت کے معاملات کو بھی دیکھ لیں تو دوسری بات ہے لیکن ہم اس بات کے پابند نہ ہوتے اور واقعی بادشاہ پر پابندی کیسی ہمارے لیے تو دن اور رات کی پابندی بھی ناممکن ہوتی بلکہ اگر ہم دن کو سونا چاہتے تو رات کا ماحول پیدا کر دیا جاتا۔ اور رات کو جاگنا چاہتے تو وہی دن بنا دی جاتی۔ ہم بادشاہ اس لیے ہوتے کہ جدھر ہماری نظر اٹھ جائے بڑے بڑے گردن فرازوں کی گردنیں جھکی ہوئی ملیں۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اگر کبھی کوئی کانسٹبل کسی دارونہ جی کے دھوکے میں غلطی سے سلام کر لیتا ہے تو اس غلطی کو سمجھتے ہوئے بھی خون میں ایک گردش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ایک روحانی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ پھر بھلا جب کانسٹبل تو کانسٹبل بڑے بڑے تھانہ دار اور کوتوال بلکہ بڑے بڑے جرنیل اور کرنل اپنی سانس تک روک کر ہم کو سلامی دیتے اور بت بن کر کھڑے ہو جاتے تو ہماری خوشی کا کیا حال ہوتا۔ اور ہماری صحت کس قدر ترقی کرتی۔ خیر یہ تمام باتیں تو بہت بلند ہیں ہم تو دراصل اپنی موجودہ حالت کو دیکھ کر اگر اپنے بادشاہ ہونے کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہماری خواہشیں ان تمام باتوں سے ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ اور ہم گھنٹوں یہی سوچتے رہتے ہیں کہ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو روز ایک نیا سوٹ پہنتے اور اعلیٰ درجہ کے ریشمی رومال عطر میں بسا کر جیب میں رکھتے۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو کبھی کسی سے کچھ قرض نہ لیتے اور اگر لیتے تو اس سے قبل کہ وہ تقاضہ کرے ہم فوراً اس کا روپیہ واپس کر دیتے۔ اور جس طرح تقاضہ کرنے والوں سے اب ناک میں دم ہے اس وقت نہ ہوتا۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ایک مرتبہ کشمیر کی سیر ضرور کرتے اور عام طور پر گرمیوں میں خس کی ٹٹیوں میں رہتے اور لو کے تھپیڑوں سے بچ جاتے۔ اگر ہم

بادشاہ ہوتے تو آرام کرسی پر لیٹ کر اپنے مضامین بولا کرتے اور ایک منشی ان کو لکھا کرتا بجائے اس کے کہ ہم خود لکھتے ہیں اور آنکھیں پھوڑتے ہیں۔ اگر ہم بادشاہ ہوتے تو ہماری تمام کتابوں کے نہایت عمدہ عمدہ ایڈیشن چھپا کرتے۔ اور ہر ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتا۔ ممکن ہے ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہوں جس کا تعلق بادشاہوں سے نہ ہوتا ہو مگر ہم تو بس انہی باتوں کی حد تک بادشاہ ہونا چاہتے تھے اس سے زیادہ ہمارا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ رہ گئی سلطنت وہ ہم سے اسی طرح غیر متعلق رہتی جس طرح اب ہے۔

وکیل

ہندوستان میں جیسی اچھی پیداوار وکیلوں کی ہو رہی ہے اگر اتنا ہی غلہ پیدا ہوتا تو کوئی بھی فاقے نہ کرتا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ غلہ پیدا ہوتا ہے کم اور وکیلوں کی فصل ہوتی ہے اچھی۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہی سب غلہ کھا جاتے ہیں اور باقی سب کے لیے فاقے چھوڑ دیتے ہیں۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ بھوکے ہندوستانی سوائے آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے سے روٹی چھیننے کے اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اسی چھینا جھپٹی اور لڑائی دنگے میں مقدمے تیار ہوتے ہیں۔ اور ان مقدموں میں پھر ضرورت پڑتی ہے ان ہی وکیلوں کی جو ہر سال کھیتوں کے بجائے کالجوں میں غلہ کی جگہ پیدا ہوتے ہیں۔

ضرورت اس کی تھی کہ مقدموں کی تعداد کے حساب سے وکیل ہوا کرتے مگر وکیلوں کی تو اور کثرت ہے کہ اگر ایک ایک مقدمہ میں ایک ایک ہزار وکیل لگا دیئے جائیں تو بھی وکیلوں کی ایک بہت بڑی جماعت ایسی باقی رہ جائے گی جو مقدمے نہ ملنے کی شکایت کرتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوکری نہ ملنے کی وجہ سے بہت سے گریجویٹ گھبرا کر وکیل تو بن جاتے ہیں مگر وکیل بننے کے بعد جب مقدمے بھی نہیں ملتے تو پھر گھبرا کر نوکری کرنے لگتے ہیں۔ اگر غور کیجیے تو اس وقت وکیلوں کی بہت سی قسمیں آپ کو ملیں گی۔ ایک قسم تو ان وکیلوں کی ہے جن کی وکالت چل رہی ہے ایک

قسم وہ ہے کہ وکیل صاحب خود چل رہے ہیں مگر وکالت نہیں چلتی۔ ایک تیسری قسم ان وکیلوں کی ہے جو نہ خود چلتے ہیں نہ وکالت چلتی ہے بلکہ دونوں سائن بورڈ بنے ہوئے دروازے پر لٹکے رہتے ہیں۔ اور چوتھی قسم ان وکیلوں کی ہے جو ہیں تو وکیل ضرور مگر وکالت سے گھبرا کر کسی اسکول میں ماسٹری کر رہے ہیں یا کسی دفتر میں کلرکی فرما رہے ہیں یا کسی رئیس کے یہاں نوکر ہیں یا اپنی سسرال میں رہتے ہیں یا فقیری لے چکے ہیں یا محض شاعر بن گئے ہیں یا کوئی اخبار نکال کر ایڈیٹر ہو گئے ہیں یا کسی فلم کمپنی میں ایکٹر ہیں یا ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر ہیں۔ یا ابھی تک گھر میں بیٹھے ہوئے یہ غور کر رہے ہیں کہ آٹا پیسنے کی چکی لگانا مناسب ہوگا یا شادی ایجنسی کھولنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ بہر حال وکالت کا ان کے دماغ میں کوئی خیال نہیں ہوتا اور نہ بھول کر بھی وہ کبھی اپنے وکیل ہونے کے متعلق غور کرتے ہیں۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ وکالت آخر کہاں تک چلے اور کس کس کی چلے۔ یقین جانیے کہ اگر ہندوستان بھر کے لوگ ایک دوسرے سے سر پھٹول میں مصروف ہو جائیں اور ہندوستان کی تمام آبادی کو سوائے اس کے اور کوئی کام نہ رہ جائے کہ وہ بس فوجداری کیا کرے تو ان وکیلوں کی شاید پوری پڑے۔ مگر قصہ تو یہ ہے کہ ہر سال ہندوستان کی آبادی جتنی نہیں بڑھتی اتنے وکیل بڑھ جاتے ہیں۔ اور اگر یہی رفتار ہے تو وہ دن قریب ہے جب ہر مؤکل خود وکیل بھی ہوا کرے گا۔ اور وکیل مؤکل بھی ہوگا۔ یعنی اس ملک میں سوائے وکیلوں کے اور کوئی نظر ہی نہ آئے گا۔ مالک وکیل، نوکر وکیل، میاں وکیل، بیوی وکیل، باپ وکیل، تاجر وکیل، گاہک وکیل، مجرم وکیل، منصف وکیل، ملزم وکیل، گواہ وکیل، جیوری وکیل۔ مختصر یہ کہ اِدھر وکیل اُدھر وکیل، اتر وکیل، دکھن وکیل، پورب وکیل پچھم وکیل گویا کہ وکیلوں کا ایک سیلاب ہوگا جس میں ہندوستان بہ جائے گا۔ اور تاریخوں میں ہندوستان کا صرف اسی قدر ذکر باقی رہ جائے گا کہ یہ ایشیا کا ایک ملک تھا کہ جس میں وکیل پیدا ہوتے تھے اور آخر ان ہی وکیلوں کی کثرت نے اس ملک کو ڈبو دیا۔ اب بھی بحر ہند میں اکثر وکیلوں کے گون اور وکالت نامے تیرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور غوطہ خوروں نے مقدمات کی مسلیں بھی برآمد کی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وکیلوں کی اس دن دونی رات چوگنی ترقی کے بعد وکیل بے چارے آخر کریں گے کیا۔ آج ہی یہ حال ہے کہ مقدموں کے لیے وکیل تو جس تعداد میں جس سائز، جس ڈزائن کے کہیے ڈھیر کر دیے جائیں۔ مگر وکیلوں کو آنکھ میں لگانے کے لیے دوا کے طور پر بھی مقدمے نہیں ملتے اور خدا جانے وہ بے چارے کیوں کر وکیل بن کر زندہ رہتے اور اپنی ظاہری شان کو قائم رکھتے ہیں۔ مگر یقین جانیے کہ جو زمانہ کل آ رہا ہے وہ آج سے بھی زیادہ ان وکیلوں کے لیے سخت ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان روز بروز مہذب ہو رہا ہے اور سمجھدار ہندوستانی لڑائی جھگڑا چھوڑتے جاتے ہیں مگر وکیل ہیں کہ ابلتے ہی آتے ہیں۔ جو وکیل پہلے سے بنے ہوئے ہیں ان کا تو حال یہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ پھر بھلا اس نئی درآمد کی کھپت کہاں ہو سکتی ہے۔ یہ مذاق نہیں ہے بلکہ وکیلوں کو واقعی اپنے متعلق ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہے کہ وہ کیا کریں گے۔ اگر ہمارا یہ خیال غلط بھی ہے کہ ہندوستان مہذب ہو رہا ہے اور لڑائی جھگڑے کو لوگ چھوڑ رہے ہیں جس کے بعد مقدمے تیار نہ ہو سکیں گے تو بھی ذرا غور تو کیجیے کہ ہر سال وکیلوں کی جو فوج ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں سے نکلتی ہے اس کے لیے نئے نئے مقدمے کہاں سے لائے جائیں گے۔ اور اگر اسی حساب سے ہندوستان میں جرائم کی رفتار بڑھتی گئی۔ اور مقدموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا تو اس کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ کہ یا تو ہندوستان ایک بہت بڑا جیل خانہ بن کر رہ جائے ورنہ سری نگر سے راس کماری تک

اور کراچی سے ڈبروگڈھ تک لمبی چوڑی کچہری ہو جائے گا۔ لیکن اس کے بعد بھی تو وکیلوں کو اپنے لیے کوئی اور راستہ ڈھونڈھنا پڑے گا۔ پھر آخر وہ ہندوستان کو جیل خانہ یا کمرہ عدالت بنا دینے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ آخر اپنے لیے ابھی سے کوئی راستہ کیوں نہیں ڈھونڈھتے۔ جنگلات کا محکمہ ہے اس میں جگہ ڈھونڈھتے رہیں۔ دنیا کے سمندروں میں بہت سے غیر آباد جزیرے ہیں۔ ان کو ڈھونڈھیں اور آباد کریں۔ ہمالیہ کی مہم میں اب تک سب کو ناکامی ہوئی ہے۔ یہ لوگ بھی کوشش کریں شاید کامیابی انھیں کی قسمت میں لکھی ہو۔ ہندوستان کے جنگلوں میں خوفناک درندے مارے مارے پھرتے ہیں اگر ان کو سدھا لیا جائے تو وہ سرکسوں میں کام آ سکتے ہیں اور سرکس والے اچھے دام دے کر ان کو خرید سکتے ہیں لہٰذا ان درندوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کریں۔

شیر کو سلام کرنا سکھائیں۔ بھالو کو حقہ پینے کی تعلیم دیں۔ بندروں کو ڈانس کرائیں۔ اور اسی طرح ان جنگلی جانوروں کو سرکس کے قابل بنائیں۔ یہ بہت فائدے کا کام ہے۔ اور اس کام میں سب ہی لگ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ذرا محنت کریں۔ دنیا کے سمندروں میں آئے دن جہاز ڈوبتے رہتے ہیں۔ ایسے ایسے خزانے ہوتے ہیں جو اگر کسی کو مل جائے تو وہ مالدار ہو جائے لہٰذا غوطہ خوری سیکھیں۔ اور اس دولت کو حاصل کریں جو مچھلیوں اور کچھوؤں کے لیے بیکار ہے مگر انسان کے کام آ سکتی ہے اور انسان کو مالا مال کر سکتی ہے۔ اسی ہندوستان میں خدا جانے زمین کے اندر کیسے کیسے خزانے ہیں۔ کہیں سونے کی کان ہے تو کہیں مٹی کے تیل کا چشمہ۔ کہیں کوئلہ ہے تو کہیں لوہے کی کان ہے۔ اگر ویران جنگلوں میں ذرا دل لگا کر کھدائی شروع کر دی جائے تو اگلے زمانہ کے بادشاہوں سے لے کر چھوٹے رجواڑوں تک کے خزانے الگ مل سکتے ہیں۔ اور یہ کانیں الگ دریافت کی جا سکتی ہیں۔ دوسرے ملک کے لوگ نئی ایجادیں کرتے رہتے ہیں کہ کہیں کسی درخت کے ریشوں سے کپڑا بنا لیا تو کہیں دو تین درختوں کی جڑوں کو ملا کر کوئی کھانے کی چیز پیدا کر لی۔ آخر اس قسم کی ایجادوں کی طرف یہ لوگ کیوں نہ متوجہ ہوں۔ کیا تعجب ہے کہ ان ہی کے دماغ میں کوئی ایسی ترکیب آ جائے جس سے کپڑے کو کھایا اور روئی کو پہنایا جا سکے۔ یا ریت کو اناج کی طرح پیٹ بھرنے کے کام میں لایا جا سکے یا آٹے کی بھوسی سے سوٹ کا کپڑا تیار ہو سکے۔ بہر حال دماغ لڑانے کی ضرورت ہے اور جب دماغ لڑ جائے تو ہاتھ پیر چلانے کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس لیے کہ اب خالی بیٹھنے اور وکالت سے کوئی امید رکھنے سے کام نہیں چل سکتا۔ خدا نہ کرے کہ وکیلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی طرح مقدمے بھی بڑھتے جائیں۔ ابھی تو خیر منشی جی ایک آدہ مؤکل کہیں نہ کہیں سے پکڑ ہی لاتے ہیں۔ اور وکیل صاحب اونے پونے اس کا مقدمہ اس لیے لڑا دیتے ہیں کہ پیٹ میں آنتیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں۔ اور گھر میں بیوی ناک میں دم رکھتی ہیں۔ آخر ان سب کو کسی طرح سمجھایا جائے یا نہیں۔ لیکن اب تو وہ وقت بھی آ رہا ہے جب منشی جی خود بھی وکیل ہوں گے، اور گھر والی بھی وکیل ہوں گی۔ پھر وکیل صاحب آسانی سے یہ نہ سمجھا سکیں گے کہ مقدمہ کیوں نہیں ملتا اور وکالت کیوں نہیں چلتی۔

صاحب لاکھ باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ دنیا کی ہوا ہی کچھ وکالت کے خلاف چل رہی ہے۔ ایک طرف وکیل بڑھتے جاتے ہیں اور وکیل عام طور پر اچھی خاصی عمر پاتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کے مؤکل قسم کے باشندے مقدموں کا شوق چھوڑ رہے ہیں۔ اگلے زمانہ میں تو یہ ہوتا تھا کہ کسی نے کسی کو دیکھ کر اگر زمین پر تھوک بھی دیا تو لیجیے ایک لاجواب چلتا پھرتا مقدمہ تیار ہو گیا جو مہینوں چلا کرتا تھا اور دونوں طرف کے وکیلوں کو خوب خوب فیسیں ملتی تھیں۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ کسی کو سر راہ مار بھی دیجیے اور پھر صرف یہ کہ دیجیے کہ معاف کیجیے گا غلطی ہوئی، بس وہیں پر

ہاتھ مل جاتے ہیں۔ اور قصہ کچہری کیا معنی تھانہ تک نہیں پہونچتا یا اچھی خاصی فوجداری کو لوگ بیچ بچاؤ کر کے ختم کرا دیتے ہیں۔ یہ دراصل وکیلوں کی حق تلفی ہے اور وکیلوں کو چاہیے کہ اس کے لیے قانون بنوائیں کہ اس طرح کا نجی بیچ بچاؤ جرم قرار دے دیا جائے ورنہ تمام معاملات یوں ہی طے ہونے لگیں گے اور یہ وکیل بے چارے کہیں کہ بھی نہ رہیں گے۔ بلکہ اگر وکیل صاحبان ہماری رائے مانیں تو ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے ان معاملات میں بھی حق پیدا کریں، جن کا تعلق اب تک قانون یا عدالت سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ مقدمہ بازی تو بہت جلد کم ہو ہی جائے گی اور وکیلوں کا کام اب دوسری صورتوں ہی سے چل سکتا ہے، جن میں سے چند ہم بتائے دیتے ہیں۔ وکیلوں کو چاہیے کہ وہ اس بات پر زور دیں، کہ چونکہ شادی بیاہ بالکل قانونی چیز ہے لہٰذا ہر شادی کے موقع پر ایک قاضی کے علاوہ لڑکی والوں اور لڑکے والوں کی طرف سے ایک ایک سند یافتہ وکیل بھی ہوا کرے تاکہ وہ شادی کی قانونی صورتوں کو باقاعدہ بنا سکیں اور کوئی قانونی خامی باقی نہ رہے۔ اسی طرح بچہ کی پیدائش کے وقت دائی کو چاہیے کہ وہ وکیل کے سامنے اپنا بیان دے اور اسی بیان کو روشنی میں بچہ کی وراثت طے پائے۔ طلاق اور عاق کے قصوں میں بھی وکیلوں کی موجودگی ضروری بنائی جائے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی چیزیں ہیں جن میں آئندہ وکیل اپنی وکالت کو کام میں لا سکیں گے۔ اور ان چیزوں کے لیے اگر ابھی سے کوشش نہ کی گئی تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ اور پھر وکیلوں کی جو حالت ہوگی وہ نہایت افسوس ناک ہوگی۔ مگر ہم کو امید ہے کہ وکیل صاحبان یہ نوبت نہ آنے دیں گے۔ بلکہ اپنے اور اپنی آئندہ نسل کے لیے یہ انتظام کر لیں گے کہ مقدموں کے علاوہ بھی قدم قدم پر ان کی ضرورت محسوس ہو۔ زمین وکیل صاحب بکوائیں گے۔ ریل کا ٹکٹ وکیل صاحب کے سامنے خریدا جائے گا۔ اسکول میں بچہ کا داخلہ وکیل صاحب کے ذریعہ ہوا کرے گا۔ پارسل وغیرہ ایک وکیل صاحب کے سامنے روانہ ہوں گے اور دوسرے وکیل صاحب کے سامنے کھولے جائیں گے۔

میاں بیوی وکیلوں کو سامنے بٹھا کر آپس میں لڑا کریں گے۔ باپ وکیل صاحب کی موجودگی میں بچے کو سزا دے گا۔ ڈاکٹر وکیل صاحب کی موجودگی میں نسخہ لکھیں گے اور مریض وکیل صاحب کے سامنے نسخہ استعمال کرے گا۔ مرنے والا وکیل صاحب سے مشورہ لے کر مرے گا۔ اور مرنے والے کے عزیز وکیل صاحب کی رائے سے کفن کا انتظام کریں گے۔ شاعر وکیل صاحب سے پوچھ پوچھ کر شعر کہا کریں گے اور ایڈیٹر اپنا ہر پرچہ وکیل صاحب کو دکھا کر شائع کریں گے۔ مقرر پہلے وکیل صاحب کو تقریر سنائے گا۔ اور جلسہ میں جانے والے پہلے وکیل صاحب سے رائے لے لیں گے۔ مختصر یہ کہ ان تمام باتوں میں اگر وکیلوں نے اپنی ضرورت پیدا کر لی تو خیر۔ نہیں تو ہم بتائے دیتے ہیں کہ آج نہیں تو کل وکیل صاحبان یہ غور کریں گے کہ ہم کیا کریں۔ اور ہمارا کام کیا ہے۔ یہ جتنی چیزیں ہم نے بتائی ہیں ان میں وکیل صاحبان اپنی ضرورت آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ بظاہر یہ معمولی معمولی باتیں ہیں مگر بڑھتے بڑھتے یہی بات کا بتنگڑ بن کر عدالتوں اور ہائی کورٹوں سے گذر کر پریوی کونسل تک پہونچ سکتی ہیں۔ لہٰذا وکیلوں کی ان میں یقیناً ضرورت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وکیل اپنی ضرورتیں خود نہ پیدا کرائیں۔

بے روزگار

ہم بیکار تو یقیناً نہیں ہیں اس لیے کہ اس مختصر سی زندگی میں جو کارِ نمایاں ہم نے انجام دیے ہیں وہ بجائے خود اس کی تردید میں پیش کیے جا سکتے ہیں کہ ایک بیکار آدمی اس قدر کارآمد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہ ہم نے متعدد چھوٹے چھوٹے امتحانات پاس کیے یا یہ کہ صرف ایک بی۔ اے کے امتحان میں مسلسل اور متواتر تین سال تک فیل ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے ایک شادی کی پھر دو مستقل بچے پیدا کیے۔ یہ تمام باتیں آپ کو اس بات کا یقین دلا دینے کے لیے کافی ہیں کہ ہم بیکار نہیں ہیں۔ البتہ اس بات کا نہایت صفائی کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم بے روزگار ضرور ہیں۔ مگر اس میں دراصل ہماری کوئی خطا نہیں ہے بلکہ اگر سچ پوچھیے تو اس میں غلطی ہے ہر اُس روزگار کی جس کو حاصل کرنے کی ہم کوشش کرتے ہیں مگر وہ خود ہم سے گریزاں نظر آتا ہے۔

ہم آپ کو باور کرانا چاہتے ہیں اور شرافت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ آپ ان تمام واقعات کو صحیح سمجھیے گا کہ ہم چار سال سے مسلسل روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم نے پولیس کی سب انسپکٹری کے لیے زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے اور ممبران کونسل سے لے کر وزراء تک کی سفارشیں اپنی تائید میں لا کر کھڑی کر دیں۔ مگر یہ مقدر ہی تو ہے کہ جب یہ تمام کوششیں کامیاب ہوئیں اور پولیس ٹریننگ اسکول میں داخلہ کا امکان پیدا ہوا تو خدا جانے کیوں کر سینہ پورے چار انچ چھوٹا نکل گیا۔ اس سلسلے میں روایات ذرا مختلف ہیں۔ ہمارے بعض احباب کا خیال ہے کہ دراصل ہمارا سینہ چھوٹا نہ تھا بلکہ سینہ ناپنے کا فیتہ ہی چار انچ بڑا تھا اور خود ہمارا خیال ہے کہ فیتہ بھی ٹھیک تھا اور سینہ بھی کافی چوڑا تھا مگر اس قسم کے امتحانی موقع پر ہماری ہمیشہ کی عادت ہے کہ کچھ سکڑ جاتے ہیں۔ اور یقیناً یہی واقعہ اس پیمائش کے وقت بھی پیش آیا ہوگا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو تمام سفارشیں دھری رہ گئیں۔ اور تمام کوششوں پر پانی پھر کر رہ گیا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ یقین جانئے کہ اگر سینہ کی طرف سے یہ گمان بھی ہوتا کہ عین وقت پر دھوکا دے گا تو ہم سب سے پہلے اسی کی خبر لیتے اور ورزش وغیرہ کر کے اس خامی کو ہرگز باقی نہ رہنے دیتے۔ بہر صورت اب تو پولیس کے خیال ہی کو دل سے نکال دینا پڑا۔ اور سب انسپکٹر کے بعد نظرِ انتخاب سب رجسٹراری پر پڑی۔

سب رجسٹراری ایک معمولی سی تنخواہ کی چھوٹی سی ملازمت ہے مگر ہم نے تو ہر سب رجسٹرار کو اس قدر مطمئن اور خوش پایا ہے کہ گویا سب رجسٹرار ہونے کے بعد یہ حضرات وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم بُری طرح سب رجسٹراری پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے لیے کوئی ایسی کوشش نہ تھی جو اٹھا رکھی ہو۔ پہلے سال تو درخواست ذرا دیر میں گذری...... لہٰذا دوسرے سال پر معاملہ ٹل گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گویا ہم کو ایک سال کا مزید موقع ملا کہ ہم اپنی امیدواری کے استحقاق کو مستحکم بنائیں۔ چنانچہ یقین جانئے کہ ہم نے اس جگہ کے لیے وہ کوششیں کی ہیں کہ آخر کار ہماری درخواست قابل غور درخواستوں میں شامل کر لی گئی۔ اور اب نہ صرف ہم کو بلکہ ہر ایک کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ ہمارا انتخاب ضرور عمل میں آئے گا۔ اور وہی ہوا بھی کہ ہم کو آخر کار انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا۔ اور ہم اپنے گھر سے سب

رجسٹرار کی حیثیت سے روانہ ہوئے مگر اب ذرا نحوست آبی ملاحظہ ہو کہ عین انٹرویو کے وقت معلوم یہ ہوا کہ ہماری عمر زیادہ ہے۔ اور زیادہ بھی کتنی صرف ایک دن۔ ہم نے لاکھ لاکھ چاہا کہ ایک دن کو نظر انداز کر دیا جائے مگر معلوم ہوا کہ اس ایک دن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خواہ ہم خود ہی نظر انداز کر دیے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ایک دن کی بزرگی نے ہم کو یہاں بھی مارا۔ اور اپنا سا منھ لے کر واپس آ گئے۔ ناامیدی اور شکستگی کا جو عالم ہم پر طاری تھا اس کی تفصیل کچھ نہ پوچھئے مگر اس کے باوجود آپ انصاف سے کام لے کر یہ بتائیں کہ اس میں آخر ہماری کیا خطا تھی۔ اگر ہمارے امکان میں ہوتا تو ایک دن کیا معنی ایک ہفتہ بعد میں پیدا ہوتے مگر قسمت میں تو یہ گردش لکھی تھی۔ ایک ہفتہ بعد کیوں کر پیدا ہوتے۔ یا پیدا ہی نہ ہوتے تو بھی یہ ہو سکتا تھا کہ نظر انتخاب کچھ دن پہلے ہی ہو جاتا۔

سب انسپکٹری کے بعد سب رجسٹراری کی کوشش میں اس غیر متوقع ناکامی نے ہمارے تمام حوصلے پست کر دیئے۔ اس لیے کہ اول تو کسی قدر لغو اور مہمل طریقہ پر ناکام ہوئے تھے، دوسرے عمر متجاوز ہو چکی تھی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اب سرکاری ملازمت کا دروازہ ہم پر بند ہو چکا تھا۔ اِدھر گھر میں یہ حال کہ اس خاکسار مربی کو مربہ سمجھ کر اہل و عیال کھائے جاتے ہیں۔ ماشاء اللہ بھرا ہوا گھر اور کمانے والے صرف ہم وہ بھی بے روزگار۔ اس میں شک نہیں کہ آخر ہم کیا کرتے اور ہمارے بس کی کیا بات تھی۔ مگر بیگم بھی ٹھیک کہتی تھیں کہ آخر وہ کیا کریں اور گھر کا خرچ کیوں کر چلائیں۔ ہمارا یہ حال کہ صبح سے روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں تو شام کو واپس آتے ہیں۔ مگر بجنسہ اس طرح جس طرح گئے تھے۔ اِدھر گھر والوں کا یہ حال کہ ہر ایک کی ضروریات ہم سے وابستہ ہیں۔ اور ہر ایک کی دعائیں ہمارے ساتھ مگر وقت تو ایسا پڑا ہے کہ ہر دعا بد دعا ہو کر لگتی ہے اور ہر کوشش مایوسی اور ناکامی پر ختم ہوتی ہے۔

سرکاری ملازمت کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد پرائیوٹ ملازمت کی فکر پیدا ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں خدا کا شکر ہے کہ ہم کو زیادہ دوڑ دھوپ کرنا نہ پڑی بلکہ فوراً ہی ایک تعلقہ دار صاحب کی ریاست میں منیجری کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک چھوٹا سا تعلقہ تھا مگر نام تو تھا ریاست کی منیجری کا۔ لہٰذا ہم بے حد خوش تھے کہ اس ملازمت پر قدم جما کر ترقی کی منزلیں طے کریں گے۔ اور تعلقہ دار صاحب کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ قابل منیجر بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ ان کی ریاست بہت زیادہ مقروض تھی۔ اس حد تک مقروض کہ خود ہم کو یہ اندیشہ تھا کہ شاید تنخواہ ماری جائے۔ مگر اس ملازمت کو غنیمت اس لیے سمجھ رہے تھے کہ بے روزگاری کے طعنوں سے نجات مل جائے گی۔ اور اگر تنخواہ نہ بھی ملی تو واجب الادا کہلائے گی۔ اس کے علاوہ کچھ نہ کچھ تو ملتا ہی رہے گا۔ جو اس موجودہ کچھ بھی نہیں سے بہر حال بہتر ہو گا۔ یقین جانیے کہ جس وقت ہم نے اپنی ملازمت کا مژدہ گھر والوں کو سنایا ہے سب کی باچھیں کھل گئیں۔ کسی نے شکرانہ کی نماز ادا کی تو کسی نے ہماری بلائیں لینا اور ہم کو دعائیں دینا شروع کر دیں۔ گویا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا اور واقعی خوشی کا مقام بھی تھا کہ تین سال کی مسلسل امیدواری اور ہر امیدواری میں ناکامی کے بعد یہ صورت نظر آئی تھی۔ چنانچہ دوسرے دن جب ہم اپنے عہدہ کا چارج لینے کے لیے چلے تو پانوں کی ڈبیہ بھی تیار تھی۔ نیا بٹوا بھی بھر دیا گیا تھا۔ اور بالکل ایسے انتظامات تھے کہ گویا ہم لام پر جا رہے ہیں۔ امام ضامن کی ضامنی۔ مبارک سلامت کے نعروں اور دہی مچھلی کے شگون کے ساتھ ہم گھر سے روانہ ہوئے راجہ صاحب کی کوٹھی کی طرف۔ اب ذرا ملاحظہ ہو ہماری سبز قدمی کہ راجہ صاحب کی کوٹھی میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ کسی ماتم کدہ میں داخل ہوئے ہیں۔ ہر طرف غمناک سناٹا در و دیوار پر

یاس برس رہی ہے۔ اور ہر ایک گردن لٹکائے ہوئے تصویرِ حسرت نظر آرہا ہے۔ ہم نے اپنے دل میں کہا الٰہی خیر۔ معلوم نہیں یہاں کیا سانحہ ہوا ہے اب کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ خدا جانے کیا خبر وحشت اثر سننے میں آئے۔ آخر کا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے راجہ صاحب کی بیٹھک میں جو پہونچے تو وہ بھی داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی خاموش شمع کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ خیر اس طرف سے تو اطمینان ہوگیا کہ خود راجہ صاحب بفضلہٖ اچھے ہیں۔ مگر سانحہ یقیناً ایسا سخت تھا کہ خود راجہ صاحب پر بھی اس کا بے حد اثر معلوم ہوتا تھا۔ خود راجہ صاحب شدتِ غم سے گم سم نظر آرہے تھے۔ آخر کار ہم نے خود ہی اپنے ایک ہم نشین سے چپکے سے پوچھا۔

"آخر واقعہ کیا ہے؟"

ہم نشین نے چپکے سے جواب دیا۔ "علاقہ کورٹ ہوگیا۔"

ہم نے بے ساختگی کے ساتھ کہا۔ "کورٹ۔"

ہم نشین نے کہا۔ "ہاں ابھی تار آیا ہے۔"

یقین جانئے کہ دل کی حرکت نے بند ہونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ فوراً یہ ضرب المثل ذہن میں آگئی کہ "جہاں جائے بھوکا وہاں پڑے سوکھا۔" راجہ صاحب کو یقیناً اپنے علاقہ کے کورٹ ہونے کا بس اسی قدر صدمہ ہوگا۔ جس قدر اس وقت ہم کو اپنی اس ملی ملائی ملازمت کے اس طرح جانے کا صدمہ تھا۔ دل بیٹھا جاتا تھا اور آنکھیں رونے کے لیے بیقرار تھیں۔ پھر بھی ایک آدھ سرد آہ اگر سرزد ہوگئی ہو تو کوئی تعجب نہیں اور اس کو راجہ صاحب کی ہمدردی میں شامل کرلیا گیا ہوگا۔ ہم تھوڑی دیر راجہ صاحب کے پاس بیٹھے رہے۔ اس کے بعد جب راجہ صاحب تخلیہ میں تشریف لے گئے تو ہم نے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کر دیا کہ آخر اب ہم کہاں جائیں۔ میز پر رکھا ہوا اخبار یوں ہی اٹھالیا مگر یہ بھی عجیب اتفاق کہ اس میں سب سے پہلے "ضرورت ہے" کے عنوان پر نظر پڑی۔ حالانکہ وہ اشتہار ہمارے متعلق نہ تھا۔ بلکہ مشتہر کو ضرورت تھی ایک ایسی لڑکی کی جو حسین و جمیل، سگھڑ اور شریف خاندان ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اشتہار ہمارے کام کا نہ تھا مگر اس کے نیچے ہی ایک دوسرا اشتہار تھا۔ جس میں ضرورت تھی ایک ایسے تجربہ کار اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جو ترجمہ میں مہارت رکھتا ہو۔ اور جس کو قلم برداشتہ سیاسی شذرات لکھنے کی مشق ہو۔ یہ اشتہار ہمارے شہر ہی کے ایک روزنامہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہم اخبار لیے ہوئے راجہ صاحب کی کوٹھی سے سیدھے اس اخبار کے دفتر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس لیے کہ دراصل اس وقت گھر جانا ہمارے لیے دشوار بھی تھا۔ اور گھر والوں کے لیے خطرناک بھی کہ جس وقت ہم اپنی ناکامی کا روح فرسا واقعہ سنائیں گے اس وقت خدا جانے کس کس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے اور شدت غم سے خدا جانے کس کا کیا حال ہو۔ یہ تو ہوسکتا تھا کہ ہم گھر پر جا کر یہ کہدیں کہ راجہ صاحب کی ریاست کے منیجر نہیں بلکہ ایک اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوگئے ہیں مگر ایک سرے سے کچھ نہیں کی خبر سننے کا گھر میں اب کوئی بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ بہرصورت ہم جس وقت اخبار کے دفتر میں پہونچے ہیں۔ وہاں نہایت انہماک کے ساتھ اخبار کی ترتیب کا کام جاری تھا۔ ہم نے چیف ایڈیٹر صاحب کو اطلاع کرائی۔ اور فوراً ہم کو باریابی کی اجازت مل گئی۔ یہ حضرت عمر خیام کے قریبی بزرگوں میں سے معلوم ہوتے تھے۔ بالکل سفید داڑھی، موٹے موٹے تالوں کی عینک لگائے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ گویا آپ فادر کرمس کے بڑے بھائی ہیں اور حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونا بھول گئے تھے۔ لہٰذا اسی کمرے میں بیٹھے رہ گئے ہیں۔ ہم کو دیکھتے ہی آپ نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر فرمایا۔

"کیسے زحمت فرمائی؟"

ہم دراصل اس وقت بے حد مرعوب ہو رہے تھے۔ لہٰذا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ البتہ اخبار اٹھا کر ان کو دکھا دیا۔ اور صرف یہ کہہ سکے کہ۔ ''یہ آپ کا اخبار ہے آج ہی کی تاریخ کا۔''

ایڈیٹر صاحب نے کہا۔ ''جی ہاں۔ اس سے آپ کا مقصد۔''

اب ہم خود سمجھ گئے کہ ہم نے کس قدر نامعقول بات کہی تھی۔ لہٰذا ذرا معقولیت کے ساتھ کہا۔ ''اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے۔''

ایڈیٹر صاحب نے اپنی عینک سے اپنی نگاہیں ہماری طرف جماتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس جگہ کے امیدوار ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''جی ہاں۔''

ایڈیٹر صاحب نے ہم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''آپ ترجمہ کر سکتے ہیں؟''

ہم نے کہا۔ ''جی ہاں۔''

ایڈیٹر صاحب نے ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک تار دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا ترجمہ فوراً کر دیجیے۔''

ہم نے اس تار کو لے کر دیکھا۔ اور پھر غور سے دیکھا مگر صرف اسی قدر سمجھ سکے کہ انگریزی رسم الخط میں خدا جانے کون سی زبان لکھی ہوئی ہے۔ تاہم قلم لے کر ترجمہ کی کوشش شروع کر دی۔ اور عین اس وقت جب کہ ایڈیٹر صاحب نے اپنی گرج دار آواز میں کہا کہ۔ ''کر چکے آپ ترجمہ۔''

ہم نے نصف سے زیادہ ترجمہ ایڈیٹر صاحب کے حوالہ کر دیا۔ ایڈیٹر صاحب نے ترجمہ کی شاید ایک ہی سطر پڑھی ہوگی۔ کہ بڑی زور سے ڈونک کر پوچھا۔ ''یہ آپ نے ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ بار بار کیا لکھا ہے؟''

ہم نے تار دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں خود نہیں سمجھا کہ اس میں جابجا اشاپ۔ اشاپ۔ کیا لکھا ہوا ہے۔''

ایڈیٹر صاحب نے مسکرا کر ترجمہ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کبھی کسی اخبار میں کام نہیں کیا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''جی نہیں۔''

ایڈیٹر صاحب نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ ''تو پھر آپ کے لیے صرف ایک صورت یہ ہے کہ آپ امیدوار کی حیثیت سے بلا تنخواہ کام سیکھیں۔ اگر آپ کارآمد ہو سکے اور جگہ خالی رہی تو آپ کو مل جائے گی۔''

ایڈیٹر صاحب کے اس جواب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ بشرطیکہ غور کرنے کی مہلت بھی دی جاتی۔ بہرصورت اس وقت ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ رضامند ہو جائیں۔ چنانچہ ہم کو امیدوار مترجم کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر ہم گھر پر جا کر کیا کہیں۔ اخبار کے دفتر میں ملازمت تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا مگر یہ سمجھانا کوئی آسان بات نہ تھی کہ فی الحال تنخواہ کچھ نہ ملے گی۔ اس لیے کہ گھر والوں کو تو ضرورت تنخواہ کی تھی ملازمت کی نہیں۔ وہ اس کو تو گوارا کر سکتے تھے کہ فی الحال تنخواہ ملے۔ خواہ ملازمت بعد میں ملتی رہے مگر یہ صورت ان کو منظور نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ ملازمت مل گئی ہے۔ مگر فی الحال تنخواہ نہ ملے گی۔ بہرصورت گھر جانے کا ایک بہانہ مل گیا تھا۔ لہٰذا ہم گھر پہونچے اور قبل اس کے راجہ صاحب کے یہاں کی ناکامی کا افسانہ سنائیں اخبار کی ملازمت کا حال سب سے پہلے سنایا۔ اس کے بعد راجہ صاحب کے یہاں کی ناکامی کا قصہ گوش گذار کیا۔ اور سب کے آخر میں یہ بھی دبی زبان سے کہہ دیا کہ ابھی تنخواہ طے نہیں ہوئی ہے۔ کام دیکھنے کے بعد طے ہوگی۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ یہ سنتے ہی سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ اور سب کے چہروں پر مردنی

چھا گئی۔ مگر مردنی چھائے یا کچھ ہو سوال تو یہ ہے کہ آخر ہم کیا کریں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ روز اخبار کے دفتر میں ترجمہ کرنے جاتے ہیں۔ اور وہاں وقت نکال کر تمام اخبارات میں ''ضرورت ہے'' کے تمام اشتہارات بلا ناغہ پڑھ جاتے ہیں۔ اور ہر جگہ کے لیے ایک ایک درخواست روانہ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد بھی نوکری نہ ملے تو یہ ہمارا مقدر۔

سفر

(میر صاحب کے یہاں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ کوئی لوٹے کے لیے چیخ رہا ہے تو کوئی سلیپر کے لیے، کسی کو بستر بند کی فکر ہے تو کوئی ناشتہ دان مانگ رہا ہے اور خود میر صاحب اپنے مصاحب نما احباب میں بیٹھے ہوئے اپنے اس سفر کے متعلق تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔)

میر صاحب : ''اماں تم ہی بتاؤ مرزا صاحب کہ اس ریل کے سفر میں کچھ نصیب دشمناں جان جوکھم تو نہیں ہے۔''

مرزا صاحب : ''آپ کی بھی واللہ ہے کہ کیا باتیں ہیں یعنی میں کہہ تو رہا ہوں کہ اسی ریل کے سفر میں سر کے بال سفید کر لیے ہیں پھر آپ کا یہ سفر تو ذرا پھیکا ہے۔ دو اسٹیشن بیچ میں تیسرے پر اصل خیر سے آپ اتر پڑیں گے۔''

میر صاحب : ''انشاء اللہ۔ مگر بھائی بات یہ ہے کہ پہلا اتفاق ہے اسی لیے جی گھبراتا ہے۔ اماں تم بھی چلنا ساتھ، تم کو ذرا اس سفر کا تجربہ ہے اور میں بالکل نیا آدمی۔ تمہارے سر عزیز کی قسم کلیجہ ہاتھوں اچھلتا ہے۔''

مرزا صاحب : ''اگر آپ کہتے ہیں تو مجھ کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مگر آپ نے تو واللہ ہے کہ کمال کر دیا۔ اس زمانہ میں آپ کے ایسے بہت کم نکلیں گے جو

ریل کے سفر سے ناواقف ہوں۔

میر صاحب : بھئی یقین مانو کہ میں خاندانی وضعداری کے خلاف یہ بات کر رہا ہوں۔ اللہ جنت نصیب کرے ابا جان مرحوم تو اس محلّہ کے باہر کبھی نہ نکلے تھے اور خدا بخشے دادا جان مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کبھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے۔ ایک میں ہوں کہ دیس چھوڑ کر پردیس کی ٹھانی ہے۔’’

مرزا صاحب : ‘‘لیجئے لیجئے شیخ صاحب بھی تشریف لے لائے۔’’

شیخ صاحب : ‘‘آداب بجالاتا ہوں حضور والا۔’’

میر صاحب : ‘‘تسلیمات عرض ہے بھائی صاحب خوب تشریف لے آئے۔’’

شیخ صاحب : ‘‘جی ہاں ابھی سنا تھا کہ سواری کہیں سیر و سیاحت کو جا رہی ہے۔’’

میر صاحب : ‘‘لو اور سنو یہ سیر و سیاحت ہے کہ آدمی دیس چھوڑ کر پردیس کا ہو جائے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں جائداد کا مقدمہ ہے نہیں جاتا ہوں تو خاندانی جائداد جاتی ہے ورنہ بھائی تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندان کو سفر سے کیا علاقہ ہے۔’’

شیخ صاحب : ‘‘بجا فرماتے ہیں جناب بیشک تشریف لے جانا ضروری ہے۔’’

مرزا صاحب : ‘‘بھائی صاحب ہمارے میر صاحب ریل کے سفر سے سخت پریشان ہیں آپ ہی کچھ سمجھایئے۔’’

میر صاحب : ‘‘میں پریشان نہیں ہوں البتہ پہلا اتفاق ہے اور سواری بھی وہ ایسی جس کے نہ لگام نہ جس پر چابک کا زور اور سنا ہے کہ پھر بھی وہ ہوا سے باتیں کرتی ہے۔’’

شیخ صاحب : ‘‘اے جناب اس میں ذرا بھی تشویش کی بات نہیں۔ میں خود برابر سفر کرتا رہتا ہوں نہایت آرام کی سواری ہے۔’’

مرزا صاحب : ‘‘میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا مگر آپ کو اطمینان نہیں ہوتا اور مجھ کو بھی ساتھ لیے جاتے ہیں۔’’

میر صاحب : ‘‘تو کیا شیخ صاحب قبلہ کو میں چھوڑ دوں گا۔’’

شیخ صاحب : ‘‘نہیں حضت میں تو معافی چاہوں گا آج کل گھر میں ذرا علیل ہیں اور خود مجکو بھی صبح چھینکیں آ رہی تھیں۔’’

میر صاحب : ‘‘یہ تو واللہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم پردیس کو سدھاریں ہمارے احباب دیس میں رہیں۔ آپ کو تو میں چھوڑ ہی نہیں سکتا۔’’

مرزا صاحب : ‘‘بھائی صاحب آپ نے تو کبھی میر صاحب قبلہ کی کسی بات میں کوئی عذر نہیں کیا ہے۔’’

شیخ صاحب : ‘‘میں اور عذر کروں۔ استغفر اللہ! میں تو صرف اجازت چاہتا تھا وہ بھی اگر منظور نہیں ہے تو جو حکم ہو بندہ حاضر ہے۔’’

میر صاحب : ‘‘بس تو بھائی صاحب آپ فوراً گھر تشریف لے جا کر اُلٹے پیروں واپس آ جایئے۔ اس لیے کہ اب وقت بہت کم ہے۔’’

شیخ صاحب : ‘‘گاڑی تو چار بجے جاتی ہے اور ابھی ایک ہی تو بجا ہے۔’’

میر صاحب : ‘‘یہ درست ہے مگر کیا اعتبار اس بے لگام گھوڑے کی گاڑی کا اور جو پہلے ہی چل دے۔’’

مرزا صاحب : ‘‘جی نہیں ایسا نہیں ہو سکتا مگر ہاں احتیاط اچھی چیز ہے۔ اگر گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہونچ جائیں تو اچھا ہے۔’’

شیخ صاحب : ‘‘میں اجازت چاہتا ہوں ابھی حاضر ہوا۔’’

میر صاحب : ‘‘بسم اللہ۔ مگر چشم براہ ہوں۔’’

شیخ صاحب : ''(جاتے ہوئے) میں ابھی حاضر ہوا بس گیا اور آیا۔۔''

(دولت (ملازم) آتا ہے سامان کے متعلق میر صاحب سے دریافت کرتا ہے)

دولت : ''سرکار بستر میں تکیے، تکلیاں، توشک، چادر، شال، پلنگ پوش رکھ دیا ہے اور کچھ تو نہ رکھا جائے گا۔''

میر صاحب : ''اور لحاف-----''

مرزا صاحب : ''ایں یعنی اس گرمی میں لحاف بھی لے جایئے گا۔''

میر صاحب : ''بھائی پردیس کا معاملہ ہے معلوم نہیں وہاں کا موسم کیسا ہو۔''

مرزا صاحب : ''چار قدم پر وہ جگہ ہے جہاں آپ تشریف لیے جارہے ہیں۔ وہاں کا موسم وہی ہے جو یہاں کا۔''

میر صاحب : ''پھر بھی اگر لحاف رکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے اور وہاں مچھردانی بھی بستر ہی میں رکھ دینا۔''

دولت : ''سرکار مچھردانی کے بانس بھی۔''

میر صاحب : ''بانس ہیں تو ضروری مگر کیوں بھئی مرزا صاحب بانسوں میں ذرا طوالت ہے۔''

مرزا صاحب : ''جی بانس وانس نہیں جو دیکھے گا ہنسے گا۔''

میر صاحب : ''اچھا بانس نہ رکھو مگر ایک آدھ قالین اور ایک آدھ گاؤ تکیہ کہیں علیحدہ ضرور باندھ دینا۔''

مرزا صاحب : ''یہ سب کیا ہوگا۔''

میر صاحب : ''یعنی وہاں کیا بیٹھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔''

مرزا صاحب : ''دن بھر کا قیام ہے اور ایک رات گزار کر واپسی کا ارادہ اس کے لیے یہ سب جھگڑا۔''

میر صاحب : ''تو آخر بے سروسامانی کے سفر سے کیا حاصل۔''

مرزا صاحب : ''بہتر ہے اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مناسب ہے۔''

دولت : ''سرکار اور کوئی چیز۔''

میر صاحب : ''کپڑوں کے دونوں بکس، لوٹے، طشت، بیسن، صابن دانی، منجن دان، چاء کے لیے پتیلی، انگیٹھی، کوئلوں کا تھیلہ، چائے کے سب برتن وغیرہ رکھ لیے ہیں۔''

مرزا صاحب : ''خدا کی پناہ آخر اتنا سامان۔''

میر صاحب : ''بھائی پردیس کا معاملہ ہے کیا گھر سے یوں ہی چل دیا جائے۔''

(ملازمہ رونق کشتی لیے ہوئے داخل ہوتی ہے)

رونق : ''اللہ سلامتی رکھے----''

میر صاحب : ''اری نیک بخت یہ کشتی میں کیا لائی ہے۔''

رونق : ''قربان جاؤں سرکار۔ یہ بڑی بیگم کے یہاں سے گلوریاں، پھول اور امام ضامن آیا ہے۔''

میر صاحب : ''اچھا۔ اچھا۔ رکھوا سے اور بڑی بیگم کو سلام کہلا دو۔''

رونق : ''سرکار ابھی تو اور کشتیاں بھی ہیں۔''

میر صاحب : ''یعنی اور ہیں ابھی۔''

رونق : ''جی ہاں سرکار اللہ رکھے سردار دلہن، بہو بیگم، شمشاد محل، نور محل، قمر دلہن سب ہی نے تو امام ضامن بھیجے ہیں۔''

میر صاحب : ''خوب۔ خوب۔ لاؤ بھئی وہ کشتیاں بھی لاؤ۔''

رونق : ''اور اللہ سلامتی رکھے بہو بیگم اور قمر دلہن نے ناشتہ بھی بھیجا ہے۔''

میر صاحب : ''اس تکلف کی آخر کیا ضرورت تھی خیر ناشتہ تو دولت کو دیدے اور

کشتیاں یہاں لے آ۔"

رونق : "اورسرکار بیگم صاحبہ نے کہاہے کہ ذری محل میں بھی تشریف لے آئیں۔"

میر صاحب : "اچھاتو چل میں آتا ہوں۔ کیوں بھئی مرزا صاحب تو میں ہوآؤں ذرامحل میں۔"

مرزا صاحب : "بسم اللہ۔ ضرور تشریف لے جائیں اور میرا آداب بھی عرض کردیں بیگم سے، اور صاحبزادی صاحبہ کو دعا۔"

(میر صاحب گھر کے اندر تشریف لے جاتے ہیں)

بیگم : "اے میں کہتی ہو کہ سدھارنے کا وقت آگیا ہے اور باہر سے آنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔"

میر صاحب : "نہیں تو بیگم میں تو بس آہی رہا تھا باہر مرزا صاحب اور شیخ صاحب کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار کررہا تھا۔"

بیگم : "تو وہ تیار ہو گئے۔ چلو اچھا ہوا دل بھی بہلے گا۔ اور اکیلے بھی نہ رہو گے۔"

میر صاحب : "ہاں صاحب بڑا اطمینان ہوگیا۔ پردیس کا معاملہ ہے ایک سے دو بھلے۔"

بیگم : "مگر میرا جی لگا رہے گا۔ جاتے ہی خط ڈال دینا۔"

میر صاحب : "بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔"

بیگم : "اچھا جیسے آج اصل خیر سے گئے تو کب پہونچو گے؟"

میر صاحب : "آج ہی بس دو بجے تک۔"

بیگم : "چلو ہٹو۔ چلے ہیں مجھ سے مذاق کرنے۔ چالیس کوس کا سفر ہے

اور آج ہی پہونچ جائیں گے۔"

میر صاحب : "تمھارے سر کی قسم بیگم بس دو گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم میں پہونچ جائیں گے۔"

بیگم : "آخر اتنا تیز جانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آدمی جائے۔"

میر صاحب : "بھئی تو اس کو میں کیا کروں ریل ایسی ہی تیز چلتی ہے۔"

بیگم : "اے ہے۔ مجھے تو ہَول ہو جائے۔"

(باہر سے شیخ صاحب آواز دیتے ہیں۔)

"جناب میر صاحب قبلہ اب ذرا جلدی کیجئے وقت قریب ہے۔"

میر صاحب : "بہت بہتر ہے میں تو بس آپ ہی کا منتظر تھا ابھی آیا۔"

بیگم : "اے تو لاؤ میں امام ضامن باندھ دوں اور ذرا سا دہی چکھ لو۔ اللہ اصل خیر سے واپس لائے۔"

صاحبزادی : "ابا جانی۔ دہی مچھلی۔"

رونق : "سرکار دہی مچھلی۔"

بیگم : "رونق ذری کشتیاں اٹھا میں امام ضامن باندھ دوں۔"

میر صاحب : "ہاں ذرا جلدی کرو وقت بہت کم ہے۔"

بیگم : "اے ایسی بھی کیا جلدی کہ ہاتھ پیر پھول جائیں۔ تم ہی تو باہر بیٹھے رہے۔"

رونق : "لیجئے سرکار یہ بڑی بیگم کے یہاں کی کشتی ہے۔"

بیگم : "پہلے ہار اٹھاؤ۔"

رونق : ''لیجئے۔''
بیگم : ''بسم اللہ۔ لاؤ امام ضامن بھی باندھ دوں۔''
رونق : ''لیجئے سرکار۔''
بیگم : ''امام ضامن کی ضامنی۔''
میر صاحب : ''اور بھی سب جلدی جلدی باندھ دو۔ دیر ہو رہی ہے۔''
بیگم : ''پھر تم نے ہاتھ پیر پھلائے۔ رونق اور کشتیاں جلدی جلدی اٹھا۔''
رونق : ''لیجئے لیجئے۔ لیجئے۔''
بیگم : ''بسم اللہ! اے ہے یہ بہو بیگم کا کار چوب والا امام ضامن کیسا پیارا پیارا ہے۔''
رونق : ''سرکار یہ شمشاد محل کے یہاں کا ہار دیکھئے گوٹے کا ہے اور امام ضامن بھی اچھا ہے۔''
بیگم : ''سردار دلہن کو تو دیکھو یہ کیلا سلک کا امام ضامن بھیجا ہے اور ہے کیا اس میں، پیسہ بندھا ہے؟''
رونق : ''نہیں سرکار اشرفی ہے یا شاید اٹھنی ہو۔''
بیگم : ''ہاں یہ ہے امام ضامن سردار دلہن دیکھیں تو دیکھتی رہ جائیں۔ کیا کہنا ہے قمر دلہن کا۔''
میر صاحب : ''بس صاحب ہو گئے سب امام ضامن؟''
بیگم : ''اے میرا امام ضامن تو بندھوا لو۔''
میر صاحب : ''ہاں صاحب وہ سب سے زیادہ ضروری ہے اور ہاں بیگم ایک ایک امام ضامن مرزا صاحب اور شیخ صاحب کو بھی بھیج دو۔''
بیگم : ''اب چلے یہ چونچلے لے کے میں اب کہاں سے لاؤں امام

ضامن۔''
میر صاحب : ''ارے صاحب کسی کپڑے میں ایک ایک روپیہ باندھ دو بس۔''
بیگم : ''اچھا تو باہر چلو میں بھیجتی ہوں۔''
میر صاحب : ''اچھا خدا حافظ۔''
بیگم : ''جاؤ اللہ کی امان امام ضامن کی ضامنی دہی مچھلی۔''
رونق : ''میاں دہی مچھلی۔''
صاحبزادی : ''میاں دہی مچھلی۔''

(میر صاحب گھر کے باہر آتے ہیں)

شیخ صاحب : ''خیر خدا خدا کر کے آپ نکلے تو گھر کے باہر۔''
مرزا صاحب : ''اور ذرا شان تو دیکھئے معلوم ہوتا ہے دولھا میاں آ رہے ہیں۔''
شیخ صاحب : ''خیر دولھا میاں نہ سہی مگر حاجی صاحب تو ضرور معلوم ہوتے ہیں ان ہاروں اور امام ضامنوں میں۔''
میر صاحب : ''بھئی کیا بتاؤں عورتیں جو چاہیں بنا دیں۔''
شیخ صاحب : ''اچھا تو اب بگھی منگوائیے نا۔ ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے۔''
میر صاحب : ''دولت سب سامان تیار ہے؟''
دولت : ''جی ہاں سرکار سب سامان تیار ہے۔ کل تیس عدد ہیں۔''
میر صاحب : ''تاش کی گڈی، چوسر، شطرنج یہ سب رکھ لیا ہے؟''
دولت : ''جی ہاں سرکار یہ سب چیزیں ہیں مگر سرکار......''
میر صاحب : ''مگر کیا کچھ بھول گئے۔ تمہارے دماغ میں تو بھونسہ بھرا ہے۔''
دولت : ''میں نے کہا سرکار کی بیٹریں حضور کو یاد کریں گی۔''

میر صاحب : “بیٹریں، خوب یاد دلایا بھئی ان کے کابک ساتھ لے لو ورنہ وہ واقعی بھڑک جائیں گی۔ ”

-x-x-

دولت : “تو اب تینتیس عدد ہوئے۔ ”

میر صاحب : “کوئی پروا نہیں تم اب دو بگھیاں فوراً لے آؤ۔ ”

(رونق گھر سے آتی ہے۔)

رونق : “سرکار بیگم صاحبہ نے مرزا صاحب اور شیخ صاحب کے لیے یہ امام ضامن بھیجے ہیں اور یہ ہار اور کہا ہے کہ جب سے مٹھو بیٹے کو آپ کے سدھارنے کی خبر ہوئی ہے وہ برابر ٹیں ٹیں کر رہے ہیں۔ ”

میر صاحب : “ارے بھئی یہ تو بڑی مصیبت ہے واقعی مٹھو بیٹے تو سخت پریشان کریں گے سب کو۔ ”

رونق : “اے سرکار وہ تو ذرا دیر بھی اگر حضور کو نہ دیکھے تو آفت مچا دیتا ہے۔ ”

میر صاحب : “کیا رائے ہے مرزا صاحب جہاں اتنا سامان ہوا ہے وہاں ایک پنجرہ اور سہی۔ ”

مرزا صاحب : “جو رائے عالی ہو مگر اتنے سامان کا تو محصول پڑ جائے گا۔ ”

میر صاحب : “بھئی تو تم ہی بتاؤ کون سی چیز ضرورت سے زیادہ ہے۔ بغیر پاندان کے کام نہیں چل سکتا بغیر ناشتہ دان کے کیسے چل سکتے ہیں۔ اور اسی طرح سب چیزیں ضروری ہیں۔ ”

شیخ صاحب : “واللہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ولایت کا سفر ہے۔ ”

مرزا صاحب : “ہاں اور کیا جتنے آدمی ولایت جاتے ہیں وہ سب طوطے کا پنجرہ اور بیٹر کے کابک لے جاتے ہیں۔ ”

میر صاحب : “تو بھئی میں ان بے زبانوں کی جان تو لوں گا نہیں چاہے جو کچھ بھی ہو۔ ”

شیخ صاحب : “نہیں صاحب ہرگز نہیں بہر حال اب سامان نکلوانا چاہیے بگھیاں آتی ہی ہوں گی۔ ”

میر صاحب : “آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے دولت آتا ہی ہوگا۔ ”

مرزا صاحب : “اپنا کام کرنے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ آپ ایک نے ہی کہی واللہ ہے کہ میں سامان نکالتا ہوں۔ ”

میر صاحب : “اماں تمہیں میری قسم جو سامان اٹھاؤ۔ یہ بھی کوئی بات ہے

(دولت گاڑیاں لے کر آتا ہے)

دولت : “سرکار بگھیاں حاضر ہیں ایک ایک روپیہ پر آئی ہیں۔ ”

میر صاحب : “اچھا تو سامان رکھواؤ گاڑی پر اور دیکھو باہر کوئی عورت سامنے نہ آنے پائے اور نہ کوئی ایسا ویسا آدمی۔ ”

دولت : “کیا مجال ہے سرکار میں راستہ بند کرائے دیتا ہوں۔ ”

میر صاحب : “اچھا تو بھئی مرزا میں ایک مرتبہ ذرا پھر گھر میں ہو آؤں۔ ”

شیخ صاحب : “بس تو پھر گاڑی مل چکی۔ ”

میر صاحب : “اماں ابھی آیا میں بس سامان رکھا گیا کہ میں آ گیا۔

مرزا صاحب : “ہاں ہاں آپ ضرور ہو آئیں مگر ذرا جلدی کیجیے۔ ”

میر صاحب : “بس میں ابھی آیا تم سامان رکھوا دو۔ ”

مرزا صاحب : “دیکھو دولت کوئی چیز رہ نہ جائے۔ ”

دولت : ’’کیا مجال ہے سرکار مگر ایک بگھی میں تو سب سامان ہی آئے گا۔‘‘

مزراصاحب : ’’بس تو ایک میں ہم سب آجائیں گے۔‘‘

شیخ صاحب : ’’مگر یار طوطے کا پنجرہ اور بیٹروں کی کابک میر صاحب کے پاس ہی رکھنا۔‘‘

مرزاصاحب : ’’ہاں یہ بھی اچھی دل لگی رہے گی۔

(نواب صاحب گھر سے برآمد ہوتے ہیں۔)

نواب صاحب : ’’لیجیے جناب میں آگیا۔‘‘

مرزاصاحب : ’’بس تو بسم اللہ کیجیے۔

(دولت کو یکا یک چھینک آجاتی ہے۔ ’’آچھیں‘‘۔)

میر صاحب : ’’لاحول ولاقوۃ۔ آؤ بھئی مرزا ذرا بیٹھ جاؤ شگون خراب ہوگیا۔ ایک ایک پان کھالو پھر چلیں گے۔ اس بدتمیز کو دیکھو کہ اسی وقت بدشگونی سوجھی تھی۔‘‘

شیخ صاحب : ’’اچھا خیر ہوگا بھی ایک ایک پان کھالیجیے۔‘‘

مرزاصاحب : ’’لیجیے مہترانی بھی آگئی۔‘‘

مہترانی : ’’اللہ سلامتی رکھے۔ ڈیوڑھی آباد۔‘‘

دولت : ’’ہٹ ہٹ سامنے سے ہٹ۔ سرکار سدھار رہے ہیں۔‘‘

میر صاحب : ’’خیر یہ بھی اچھا ہی ہوا بہر حال اب پان کھا کر چلتے ہیں۔‘‘

دولت : سرکار پان حاضر ہیں۔‘‘

میر صاحب : ’’لو بھئی میرزا صاحب اب اٹھو۔‘‘

شیخ صاحب : ’’بسم اللہ۔‘‘

مرزاصاحب : ’’الا اللہ۔‘‘

میر صاحب : ’’چل دولت باہر سب کو ہٹادے۔‘‘

دولت : ’’حضور باہر کوئی نہیں ہے تشریف لے چلیں۔‘‘

(یکا یک بلی کی آواز آتی ہے۔)

میر صاحب : ’’ہا کمبخت راستہ کاٹ گئی۔‘‘

مرزاصاحب : ’’یہ تو بہت بُرا ہوا کہ بلی راستہ کاٹ گئی۔‘‘

میر صاحب : ’’لوٹ آؤ بھائی شیخ صاحب یہ شگون نہایت منحوس ہوتا ہے۔‘‘

(اندر سے رونق آتی ہے۔)

رونق : ’’سرکار بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ بلی راستہ کاٹ گئی ہے اب میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔

میر صاحب : ’’ہے تو واقعی یہ برا مگر مقدمہ کا کیا ہوگا۔‘‘

رونق : ’’سرکار جائیداد آپ پر سے صدقے کی مگر جب نگئی راستہ کاٹ جائے تو جانا نہ چاہیے۔

میر صاحب : ’’واقعی اب تو میرے قدم بھی نہیں اٹھتے۔‘‘

شیخ صاحب : ’’ھت یہ سب وہم ہیں بالکل عورتوں کی باتیں ہیں۔‘‘

میر صاحب : ’’ایں بھئی شیخ صاحب یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اماں یہ کہا کہہ رہے ہو یعنی بلی راستہ کاٹ جائے اور تم اس کو معمولی بات کہو۔‘‘

مرزاصاحب : ’’نہیں صاحب یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے ایسی حالت میں سفر ہرگز نہیں ہوسکتا۔‘‘

میر صاحب : "بھائی شیخ صاحب میں تم سے سچ کہتا ہوں تمہارے سر عزیز کی قسم کہ ابا جانی مرحوم کے ایک دوست گھوڑے پر سوار تھے اور جنگل کا راستہ تھا۔ کہ بلّی راستہ کاٹ گئی بس پھر کچھ نہ پوچھو کہ گھوڑے کا ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے ٹھوکر لی اور سوار سر کے بل گرا۔"

مرزا صاحب : "اے ہے۔ بڑی چوٹ آئی ہوگی جناب۔"

میر صاحب : "اماں چوٹ۔ یقین جانو کہ تمام پیشانی لہولہان ہوگئی۔"

شیخ صاحب : "اتفاقاً ہوگیا ایسا یہ کیا ضروری ہے کہ ہر مرتبہ ایسا ہی ہو۔"

رونق : "اے واہ میاں اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ میرا تو سن کر ہی کلیجہ ڈھڑک رہا ہے۔"

میر صاحب : "بھئی شیخ صاحب بعض وقت تو تم نہایت ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو۔ گویا یہ شگون اور بدشگونی کوئی چیز ہی نہیں۔"

شیخ صاحب : "صاحب میں تو ان باتوں کو مہمل سمجھتا ہوں۔"

مرزا صاحب : "بھائی صاحب یہ تو نہ کہیے۔ یہ کہیے کہ آپ کچھ نئی روشنی کے آدمی ہو کر رہ گئے ہیں۔"

میر صاحب : "اماں تمھیں میری قسم ذرا دیکھو تو شیخ صاحب کی ڈھٹائی کہ بلی راستہ کاٹ جائے اور یہ شیر ڈٹا رہے۔"

مرزا صاحب : خیر اب سفر تو میری ناچیز رائے میں مناسب نہیں ہے البتہ خیال ہے تو صرف یہ کہ مقدمہ کا کیا ہوگا۔

رونق : "اے میاں چولھے میں گیا مقدمہ۔ اللہ جان کی سلامتی رکھے تو ایسے ایسے سیکڑوں مقدمہ ہوں گے۔"

میر صاحب : "بھئی واللہ یہ بھی ایک ہی رہی۔ اماں سنتے ہو مرزا ان بی رونق کی

دعا کو ایسے ایسے سیکڑوں مقدمے میرے لیے مانگ رہی ہیں۔"

رونق : "اے تو قربان جاؤں مجھے کیا معلوم ......"

میر صاحب : "تو بھئی مرزا اب تم ہی بتاؤ کہ اس مقدمہ کا کیا کیا جائے۔"

مرزا صاحب : "حضت میری عقل خود حیران ہے۔"

(دولت ملازم آتا ہے۔)

دولت : "سرکار تو کیا سامان اتار لیا جائے؟

میر صاحب : "سامان تو خیر ضرور اترے گا۔ خواہ مقدمہ رہے یا جائے۔"

دولت : "تو سرکار بگھی والوں کو تو کرایہ دینا ہی پڑے گا۔"

میر صاحب : "ہاں ہاں تو کس نے کہا ہے کہ نہ دو۔"

مرزا صاحب : "میری ناقص رائے میں تو حاکم کو تار دے دیا جائے۔"

میر صاحب : "آخر کیا تار دیا جائے۔

شیخ صاحب : "یہی کہ بلی راستہ کاٹ گئی اور ملازم کو چھینک آ گئی۔"

مرزا صاحب : "نہیں صاحب بس یہ تار دیا جائے کہ گاڑی چھوٹ گئی۔"

شیخ صاحب : "قبلۂ عالم یہ بھی خبر ہے کہ جہاں آپ کو جانا ہے وہاں دن بھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو ہر گھنٹہ پر گاڑی چھوٹتی ہے۔"

میر صاحب : "اماں تو کچھ اور سوچو۔"

شیخ صاحب : "آخر تو اس میں کیا مضائقہ ہے کہ آپ اب دوسری گاڑی سے چلیں۔"

میر صاحب : "بھائی اب بیگم صاحب ہرگز نہ جانے دیں گی۔"

شیخ صاحب : "تو یہ بھی سمجھ لیجیے کہ جائداد کا معاملہ ہے کہیں خدانخواستہ جائداد

کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔‘‘

(رونق ملازمہ آتی ہے۔)

رونق : ’’سرکار بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ اب کچھ ہی ہو جائے میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔‘‘

میر صاحب : ’’ارے صاحب تو میں کہاں جا رہا ہوں۔‘‘

مرزا صاحب : ’’تو اب فرمائیے کہ کس مضمون کا تار دے دیا جائے۔‘‘

میر صاحب : ’’میرے خیال میں تو بس یہی تار دیدو کہ مجبوراً سفر ملتوی کر دیا ہے۔‘‘

شیخ صاحب : ’’جناب والا اس کا اثر مقدمہ پر کیا پڑے گا۔‘‘

مرزا صاحب : ’’مگر بھائی مجبوری کی وجہ سے سفر ملتوی کیا ہے نا۔‘‘

شیخ صاحب : ’’کیا مجبوری ہے؟ آخر یہی نا کہ چند وہم گھیرے ہوئے ہیں۔‘‘

میر صاحب : ’’بھئی شیخ صاحب تم تو واللہ ہے کہ ان باتوں کو پھر وہم کہہ رہے ہو بس بلی راستہ کاٹ جائے اور وہم۔‘‘

مرزا صاحب : ’’میں آپ سے عرض کروں کہ ہمارے بزرگ تو ان ہی خیالات کی وجہ سے سفر ہی کو مناسب نہ سمجھتے تھے۔

(دولت گھبرایا ہوا آتا ہے۔)

دولت : ’’سرکار۔ سرکار۔ غضب ہو گیا۔ ایک بگھی کا گھوڑا بگڑ کر بھاگا ہے مع تمام سامان کے اور بیٹروں کے کابک بھی اسی بگھی پر ہیں۔‘‘

میر صاحب : الٰہی خیر۔ خدا میری بیٹروں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ذرا دیکھو بھئی مرزا۔ اماں ذرا جاؤ شیخ صاحب۔‘‘

رونق : ’’وہ تو مواشگون ہی خراب ہو گیا تھا۔ اس موئے نکٹے دولت کو بھی اسی وقت چھینک آنا تھی۔‘‘

دولت : ’’ذرا زبان سنبھالیے۔ نکٹا میں کیوں ہوتا جو کہے وہ خود اور اس کی سات پشت۔‘‘

رونق : ’’دیکھئے سرکار یہ موا میری پشتوں کو بھی منہ بھر بھر کے کہہ رہا ہے۔‘‘

میر صاحب : ’’ارے صاحب یہ لڑائی کا وقت نہیں ہے۔ خدا کو یاد کرو میری بیٹریں اس وقت سخت مصیبت میں ہیں۔‘‘

مرزا صاحب : ’’لیجیے حضت اپنی بیٹریں۔ میں نے جاتے ہی گھوڑے کو پکڑ لیا۔‘‘

میر صاحب : ’’بھائی واللہ کمال کیا۔ اماں ذرا دیکھو تو بٹیروں کا دل کیسا دھڑک رہا ہے۔ مگر واللہ ہے کہ خدا نے ہم لوگوں کو کیسا بچایا۔‘‘

شیخ صاحب : ’’صرف آپ کی صراحی گر کر ٹوٹی باقی سب خیریت ہے۔‘‘

میر صاحب : ’’خیر بھائی صراحی گئی تو جائے سب کی جانوں کا صدقہ اترا۔‘‘

مرزا صاحب : ’’ہاں صاحب۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔‘‘

شیخ صاحب : ’’لاحول ولاقوۃ۔ کیا ہنگامہ ہوا ہے بیٹھے بٹھائے۔‘‘

میر صاحب : ’’ایسا ویسا ہنگامہ۔ ذرا میرا کلیجہ تو دیکھو کہ اب تک بے قابو ہے۔ ذرا دولت شربت انار تیار کرو۔ اور بھئی مرزا ذرا میں محل میں ہو آؤں تا کہ بیگم کو اطمینان ہو۔‘‘

مرزا صاحب : ’’تو ہم لوگ اجازت چاہتے ہیں۔‘‘

میر صاحب : ’’اچھا بھئی خدا حافظ۔‘‘

شیخ صاحب : ’’آداب بجالاتا ہوں۔‘‘

مرزا صاحب : تسلیمات عرض کرتا ہوں۔‘‘

پنشن

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ع

تقریب کچھ تو بہر خرافات چاہیے

چنانچہ آج بھی تقریب تو یہ ہے کہ خان صاحب بی. اے. ایل. ایل۔ بی انسپکٹر دفاتر رجسٹریشن اپنی مدت ملازمت ختم کر کے پنشن پر تشریف لے جا رہے ہیں اور ان کو صاحب انسپکٹر جنرل بہادر کے دفتری عملہ نے الوداعی دعوت دی ہے۔ اب اس تقریب کے سلسلہ کی خرافات یہ ہے کہ اس خاکسار سے الوداعی نظم پڑھنے کی فرمائش کی گئی ہے۔ مگر چونکہ یہ خاکسار اس محکمہ رجسٹری کا رجسٹرڈ شاعر نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو اختیار ہے کہ نظم خواہ اشعار کی موزونیت کے ساتھ پڑھے یا نثر کی سپاٹ جذبات نگاری کے ساتھ۔

بہر حال امر واقعہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کے مواقع پر نظم تو وہ پڑھ سکتا ہے جس کو زندگی بھر روزی اور موت دونوں سے بے فکر رہ کر صرف داد حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے۔ مگر چونکہ اس خاکسار کے نزدیک اس قسم کی نظموں میں زندگی کے نکات و رموز۔ مستقبل کے نشیب و فراز۔ مدبرانہ مشورے۔ حکیمانہ پند و نصائح اور استادی کے دیگر گر نہیں سما سکتے۔ لہٰذا کیوں نہ اپنی مادری زبان میں انسانوں کی گفتگو کی جائے اور اپنے خیالات کو ردیف قافیہ کی مجبوریوں میں کیوں مبتلا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ

اگر اس موقع پر یہ خاکسار نظم کہتا تو زیادہ سے زیادہ اس نظم میں یہی ہوتا کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ چڑیوں کے چہچہے خاموش ہیں بہار پر خزاں کا فالج نما حملہ ہوا ہے۔ گلستاں میں ویرانہ کا ویران منظر ہے۔ دنیا میں اندھیرا ہے اس لیے کہ خاں صاحب چودھری سراج الحق آج ملازمانہ بندشوں سے آزاد ہو کر پنشن پر جا رہے ہیں۔ ایک دیرینہ رفیق چھوٹ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نظم میں چودھری صاحب کے کچھ ایسے صفات بیان کیے جاتے جن سے شاعر اور شاعری کے شجرہ کے تمام مرحوم اور موجود بزرگ بلکہ شاعر کے فرشتے بھی ناواقف محض ہوتے۔ پھر اس نظم میں کچھ دعائیہ اشعار ہوتے اور اس کے بعد مقطع۔ گویا بحیثیت مجموعی یہ نظم کذب و افترا کا اور تصنع بلکہ منافقت کا ایک ایسا مجموعہ ہوتی کہ سننے والے بھی شاعر کو کذاب سمجھتے اور عاقبت میں اس افترا پردازی کی جواب دہی بھی کرنا پڑتی۔ لہٰذا سب سے بہتر اور محفوظ صورت یہی سمجھ میں آئی کہ ناموزونیت کے ساتھ محض سچ بولا جائے۔ تاکہ اپنے جذبات کا سلیس اُردو میں اظہار بھی ہو جائے اور کوئی گناہ بھی سرزد نہ ہو۔

اس مختصر تمہید کے بعد یہ خاکسار چودھری صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پنشن کے فلسفہ پر اجمالی روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ایک ملازم نما انسان یا انسان نما ملازم کی زندگی کا ایک اہم ترین انقلاب یہ پنشن ہی ہے۔ بلکہ مجھ کو کہنے دیجیے کہ جس طرح عام انسانوں کی زندگی تین حصوں میں تقسیم ہے یعنی بچپن جوانی اور بڑھاپا اسی طرح ایک ملازم انسان کی زندگی بھی تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہے تعلیم یہ ملازم کا بچپن ہے۔ ملازمت یہ ملازم کی جوانی ہے اور پنشن یہ ملازم کا بڑھاپا ہے۔ ان باتوں کو چودھری صاحب موصوف خود بھی جانتے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ ماشاء اللہ عاقل بالغ ہیں۔ عاقل تو خیر وہ ہمیشہ سے ہیں مگر ایک سرکاری ملازم پنشن لینے کے بعد بالغ بھی ہو جاتا ہے یا یہ کہیے کہ اس کو پنشن لینے کے بعد ہی اپنے بلوغ کا احساس

ہوتا ہے۔ بہرحال چودھری صاحب اب مسلم طور پر عاقل و بالغ ہیں۔ اور ان نکات کو وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ دراصل ایک ملازم کی زندگی کے یہ تینوں دور ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ دو دور تو چودھری صاحب دیکھ آئے، اب پنشن کے انقلاب کو دیکھنا باقی ہے اور اس انقلاب کے لیے وہ ہر طرح تیار ہیں۔

پنشن دراصل ایک انسان کے تمام ماحول کو $\frac{۱}{۲}$ بنا دینے کا دوسرا نام ہے۔ ایک ملازم کا ماحول کیا ہے صرف اس کی تنخواہ اور واقعہ بھی ہے کہ ایک سرکاری ملازم کی دنیا جس محور پر رقص کرتی ہے وہ صرف تنخواہ ہے لیکن پنشن کے بعد جب تنخواہ ہی $\frac{۱}{۲}$ رہ جائے تو پنشنر خود اپنے کو بھی $\frac{۱}{۲}$ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس کو اپنی زندگی کے $\frac{۲}{۳}$ حصہ کو $\frac{۱}{۲}$ کی مناسبت سے بسر کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ چونکہ ریاضی کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس کو اکاؤنٹ صاحب پر چھوڑ کر مجکو یہ عرض کرنے دیجیے کہ اب چودھری صاحب اپنی مسلّم دنیا کو چھوڑ کر اس ادھوری دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ جہاں ان کو اپنی ضروریات کو نصف بنانا ہے تاکہ پنشن کی آمدنی اور بڑھاپے کے خرچ کا توازن درست رہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک پنشن یافتہ اپنے اخراجات کو اس حد تک نصف کرے کہ ایک ہی پائنچے کا پاجامہ پہننے لگے ایک ہی آستین کا کرتا پہنے ایک ہی جوتا خریدے ایک ہی آنکھ کی عینک لگائے۔ محض انٹرول تک سینما دیکھے۔ آدھی دور پیدل چلے اور آدھی دور تانگہ پر۔ دو کے بجائے صرف ایک روٹی کھائے اور نصف بہتر کی ہر فرمایشوں میں سے صرف ایک کو پورا کرے۔ بلکہ مصیبت تو یہ ہے کہ ان میں کوئی بات بھی نہ ہو اور خرچ آدھا ہو جائے یہ دراصل ایک ایسا معمہ ہے جس کو صرف وہی حل کر سکتا ہے جو پنشن پا کر اپنے فرصت کے اوقات میں دماغ سوزی سے کاٹے اور اس عقدہ کے حل کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ چودھری صاحب کے پاس اب وقت بھی ہے۔ اور فرصت بھی اور سوائے اس کے اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے کہ سب سے پہلے اسی مسئلہ کو طے کیا جائے۔ یقین جانئے کہ چودھری صاحب دونوں پیروں میں جوتے پہنیں گے اور اس کو بھی پسند نہ کریں گے کہ پاجامہ کے بجائے نیکر استعمال کرنا شروع کریں۔ البتہ بچت کی صورتیں اور خرچ کا توازن اب اس طرح قائم ہوگا کہ چھ روپے کے جوتے کے بجائے اب تین روپے کے جوتے سے کام چل جائے گا۔ موزوں کے لیے یہ کوئی ضروری بات نہ ہوگی کہ وہ خاص مسٹر روزولٹ کے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہوں۔ لباس بھی اسی طرح سادہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ بڑھاپے میں تکلفات کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔ نہ جوانی ہے نہ اب جوانی کی خودستائی اور خودنمائی اور غالباً اسی وجہ سے سرکاری نقطۂ نظر یہ قائم ہوگیا ہے کہ انسان کو اس زمانہ میں پوری تنخواہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ مگر یہ خاکسار جو بفضلہٖ بوڑھا تو نہیں ہے البتہ بڑھاپے کے غم میں دبلا ضرور ہے اس کلیہ اور اس نظریہ کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ جوانی کے اخراجات بڑھاپے سے دوچند اور بڑھاپے کے مصارف جوانی سے نصف ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بڑھاپے میں کریم، اسنو، عطر، پاوڈر اور اسی قسم کی دوسری چمک دمک کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ انسان ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے مگر اسی کے ساتھ بڑھاپے کے مزید اخراجات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ بڑھاپے میں جوانی کی تشکیل کے لیے انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً خضاب کے اخراجات، دانتوں کی اکھڑوائی اور بنوائی، پیری اور صد عیب کے مصارف اور مختلف ادویات کے مصارف اور مختلف ادویات کی قیمتیں پھر ایک بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ اسی زمانہ میں انسان کو خیرات کی بھی فکر ہوتی ہے اور وہ زندگی بھر کی کسر نکالنا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر کچھ مصارف کم ہو جاتے ہیں تو اس سے دوچند بڑھ جاتے ہیں اور یہ اخراجات ایسے ہوتے ہیں جو عمر کے ساتھ ہی ساتھ بڑھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان اقتصادی نشیب و فراز کو چودھری

صاحب خود سمجھ سکتے ہیں۔ اور وہ یقیناً اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش فرمائیں گے۔

پنشن کا دور اور بہت سی حیثیتوں سے بھی انقلابی ہوتا ہے مگر باقی انقلابات ایک حد تک خوش گوار کہے جا سکتے ہیں جن کا احساس چودھری صاحب کو اب ہوگا۔ یقین جانیے کہ اب تک چودھری صاحب کی زندگی یہ رہی ہوگی کہ وہ ۲۴ گھنٹہ سے ۲۵ گھنٹے انسپکٹر دفاتر رجسٹریشن رہتے ہوں گے اور اپنی ذاتی شخصیت کو سمجھنے کا آپ کو کبھی موقع ہی نہ ملتا ہوگا۔ سوتے میں خواب اسی انسپکٹری کے دیکھتے ہوں گے اور جاگتے میں اسی انسپکٹری کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کی دعائیں دل سے نکلتی ہوں گی۔ آپ کے نزدیک جنت کا تخیل صرف یہ ہوگا کہ صاحب انسپکٹر جنرل بہادر آپ سے خوش ہیں اور آپ کی خدمت کو سراہتے ہیں اور عاقبت کا تخیل زیادہ سے زیادہ یہ کہ نیک نامی کے ساتھ پنشن مل جائے۔ مگر اب پنشن حاصل کرنے کے بعد آپ کو انسپکٹری کے بجائے اپنی انسانی حیثیت پر غور کرنے کا موقع بھی ملے گا اور اس کا علم بھی ہوگا کہ عاقبت یہ نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ایک دوسری منزل کا نام ہے۔ چنانچہ اب اس نصف تنخواہ کے زمانے میں تسبیح و جانماز، چٹائی، اور بدھنی کے مصارف کا بھی اضافہ ہوگا اور نماز کے ساتھ اور ادعیہ اور وظائف بھی شروع ہو جائیں گے۔ اکثریت پانے والے بزرگ اپنی بیکاری سے گھبرا جاتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں۔ کہ آخر کیا کریں۔ مگر جو صاحبان ہوش ہیں اور جن کا دیدہ عبرت نگاہ چشم سے بے نیاز ہے یعنی جو گوش نصیحت نیوش کے بہرے نہیں وہ جانتے ہیں کہ ع

ٹک حرص و ہوکو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

کا مفہوم کیا ہے اور ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ قضائے عمری میں اپنا وقت گذارتے ہیں اور عبادت کی فراوانی فرصت کو محدود ثابت کر دیتی ہے۔

بہر حال ان تمام منازل سے چودھری صاحب کو بھی گذرنا ہے اور چودھری صاحب ہی پر کیا منحصر ہے ان کے وہ تمام میزبان جو آج عرضی فدوی ہیں کل پنشنر بنے والے ہیں ؎

ازل سے سب ملازم گویا پنشن خوار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

چودھری صاحب کے جانے اور پنشن پانے کا غم وہ کرے جو آپ کا دشمن ہو، جس کو آپ کی یہ روحانی، جسمانی، دماغی اور ذہنی آزادی بری معلوم ہوتی ہو اور جو یہ نہ دیکھ سکتا ہو کہ ایک طائر آزاد اپنے سمیں قفس سے آزاد ہو کر فضا میں فراٹے کیوں بھر رہا ہے۔ مگر کم سے کم یہ خاکسار تو چودھری صاحب کی ذاتی زندگی کا آغاز اسی لمحہ سے سمجھ رہا ہے اور ان کو مبارکباد دیتا ہے کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے ہیں۔ ان کے ماتحتوں کا جذبہ یہ ہے کہ آج سب با چشم نم ان سے رخصت ہو رہے ہیں اور ان کے افسران کا رویہ یہ ہے کہ خود صاحب انسپکٹر جنرل بہادر ان کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ گویا آج ماں باپ کی یہ دعا قبول ہوئی ہے کہ بڑھے ہو پروان چڑھو بڑھا ہونا تو سب سمجھ رہے ہیں اور سمجھنے سے زیادہ دیکھ رہے ہیں مگر یہ کسی کو نہیں معلوم کہ پروان چڑھنا دراصل پنشن پر جانے کو کہتے ہیں۔

اگر میں لیڈر ہوتا!

وہ تو کہیے کہ ہم تھوڑے سے شاعر اور تھوڑے سے ایڈیٹر ہوکر رہ گئے۔ ورنہ اگر کہیں لیڈر بن جاتے تو مزہ ہی آجاتا۔ لیڈر بن جانے کے بعد عجیب زندگی ہوتی اور اس زندگی کو کچھ اس طرح بسر کرنا پڑتا کہ عجوبۂ روزگار بن کر رہ جاتے۔ دنیا کی نظریں ہمارے اوپر ہوتیں اور ہماری نظریں ان اخبارات پر جن میں ہماری تصویر اور ہمارے کارٹون چھپا کرتے۔ حالانکہ کارٹون کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اس لیے کہ لیڈر بن جانے کے بعد ہماری یہ تصویر بجائے خود کارٹون ہوتی۔ عجیب وغریب شکل وصورت کے ساتھ عجیب وغریب لباس میں جو تصویر ہو اسے ہم تصویر سے زیادہ کارٹون کہتے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک کارٹون کی تو اب بھی یہی تعریف ہے کہ تصویر تو وہ ہے جو عجیب وغریب نہ معلوم ہو اور کارٹون اس تصویر کو کہتے ہیں جو عجیب وغریب معلوم ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے خیال میں جو تصویر عجیب وغریب نظر نہ آئے وہ کسی لیڈر کی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہماری ہر تصویر کارٹون ہوئی اور ہم خود دل ہی دل میں اپنی تصویر کے متعلق کہا کرتے کہ عجیب چیز واقع ہوئے ہیں ہم بھی۔ بات یہ ہے کہ ایک لیڈر اور ایک عام انسان میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق ایک لیڈر اور ایک عام انسان کے لباس میں ہونا چاہیے۔ وہی فرق ایک عام انسان کی شکل وصورت اور ایک لیڈر کی شکل وصورت میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا بھی ہے کہ ایک لیڈر کا لباس عام انسانوں سے کچھ مختلف ہوکر تھوڑا بہت روحانی لباس بن جاتا ہے۔ ایک لیڈر کی شکل عام انسانوں سے کچھ علیحدہ ہوکر الف لیلیٰ کی تصاویر سے مشابہ ہوجاتی ہے اور ایک لیڈر کی نقل وحرکت عام انسانوں سے ممتاز ہوکر کچھ جنون کی سی نقل وحرکت بن جاتی ہے۔ ورنہ یہ بھی تو غور کیجیے کہ ایک لیڈر آخر پہچانا کیسے جائے اور اس کو لیڈر کون کہے۔ بہر حال ہم اگر لیڈر ہوتے تو ہمارا بھی یہی حال ہوتا کہ لباس پر نور برستا اور چہرے پر کھدر۔ چہرے پر متانت پیدا کرتے اور لباس سے دعوت تبسم دیتے۔ اب تو حال یہ ہے کہ جتنا اچھا لباس پہن کر جس قدر اکڑتے ہیں اتنا ہی بڑا آدمی اپنے کو سمجھتے ہیں لیکن لیڈر ہوتے تو جتنا معمولی لباس پہنتے اور جس قدر کسر نفسی کے ساتھ مسکراتے اس قدر بلند مرتبہ ہم کو ملتا۔ اب تو یہ فکر رہتی ہے کہ کوئی ہمارے چہرے سے ہماری فاقہ مستی کا راز نہ معلوم کرلے لیکن لیڈر ہونے کی صورت میں میں تحط زندگی کے تمام آثار چہرے ہی سے نمایاں کرنا پڑتے مختصر یہ کہ جو زندگی اب بسر کر رہے ہیں اس کو لیڈری کی زندگی سے کوئی نسبت ہی نہ ہوتی۔ اب تو مرغن غذا، عمدہ لباس اور گرم جیب ہماری زندگی کا سہارا بنی ہوتی ہے لیکن لیڈر کی صورت ان تمام سطحی چیزوں سے بحال نہیں رہتی بلکہ اس کے خون میں گرمی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب اس کا نام لے لے کر زندہ باد کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں۔ اس کا جلوس نکالا جاتا ہے، اس پر پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ اس کی گاڑی میں بجائے گھوڑے یا بیل کے انسان جوتے جاتے ہیں اور اس کے دیکھنے کے لیے سڑکوں پر دو رویہ ایسا مجمع ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر سوار ہوکر اپنی حسرت دیدار کی تکمیل کرتے ہیں۔ جس وقت یہ اعزاز ہم کو حاصل ہوتا ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ ہمارا وزن بڑھ جاتا، ہمارے بہت سے امراض بغیر کسی دوا کے دور ہوجاتے اور ہمارا خون بغیر کسی ٹانک کے بڑھ جاتا۔ ہم ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہاتھ

پھیلا پھیلا کر گردن ہلا ہلا کر اور مسکرا مسکرا کر مجمع کے سلاموں کا جواب دیتے اور دل یہی چاہتا کہ جلوس کا راستہ دس پندرہ میل اور طویل ہو جائے اور جس گاڑی پر ہم سوار ہیں اس کی رفتار کچھ اور کم ہو جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک ہم اپنی ان پرستاریوں کا منظر دیکھ سکیں۔ جلوس کے اختتام پر ہم جلسہ گاہ میں لائے جاتے اور ہمارے پہنچتے ہی وہاں ایک کھلبلی مچ جاتی۔ لوگ ہمارے نام کے ساتھ سیکڑوں نعرے بلند کرتے ہم پر پھولوں کی مسلسل بارش ہوتی اور آخر کار ہم باوجود اس تمام افتخار کے اپنے نزدیک “عرضی فدوی” بنے ہوئے پلیٹ فارم پر آتے اور ہم کو ہاروں سے لاد دیا جاتا ہم کو جتنی عزت دی جاتی اس قدر ہم خاکسار اور ہیچمیدان قسم کے ہو جاتے اور آخر کار تالیوں کے شور اور نعروں کے ہنگامے میں ہم تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے۔ مصور مختلف زاویوں سے ہماری تصویر لیتے۔ کسی میں منہ کھلا ہوا تو کسی میں آنکھ بند کسی میں منہ چڑھاتے ہوئے تو کسی میں ہاتھ مٹکاتے ہوئے مگر ہم ان تصاویر کی طرف گویا متوجہ بھی نہ ہوتے حالانکہ ہماری تمام تر توجہ اسی طرف ہوتی کہ کوئی تصویر بے ڈھنگی نہ آ جائے۔ مگر چونکہ اس احتیاط کا اظہار ہماری لیڈری کے شایان شان نہ ہوتا لہٰذا ہم دل ہی دل میں سنبھلتے اور خاموشی کے ساتھ ان تمام احتیاطوں کو پیش نظر رکھتے اور بظاہر صرف تقریر کر رہے ہوتے کہ۔ اے میرے بھائیو! ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

کیا مجھ کو تمہاری طرح ریشم ملائم نہیں معلوم ہوتا۔ لیونڈر میں خوشبو نہیں آتی اور دوسری ولایتی چیزیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ مگر میں اپنے ہندستانی فاقہ مست بھائیوں سے غداری کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔ (اس پر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوتے) میں جانتا ہوں کہ یہ غریب ہندستانیوں کی حق تلفی ہے (پھر نعرے بلند ہوتے) اور میں جانتا ہوں کہ اس طرح میں اپنے ہندستانی بھائیوں کے منہ سے روکھی سوکھی روٹی کا بھی نوالہ چھین رہا ہوں۔ (اس پر دیر تک فلک شگاف نعرے بلند ہوتے)

پھر ہم حاضرین جلسہ کو حفظان صحت کے اصول بتاتے اور ساتھ ہی ساتھ امور خانہ داری کی بھی تلقین کرتے اس لیے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا انسان اپنے گھر ہی سے سیکھتا ہے۔ بہرحال حفظان صحت اور امور خانہ داری کے بعد ہم فوراً اپنی تقریر کا رخ کفایت شعاری کی طرف پھیر لیتے اور پھر شعر و شاعری کی طرف۔ اسی سلسلے میں مرزا غالب، میر تقی میر، میاں نظیر اکبرآبادی اور جناب اکبر الہ آبادی کے زیادہ سے زیادہ شعر حاضرین کو سنا جاتے کہ ہماری تقریر ذرا طویل ہو جاتی اور حاضرین یہ کہہ سکتے کہ بڑا بولنے والا ہے۔ مگر اس کے باوجود جب ہماری تقریر ۱۵ منٹ ہی میں ختم ہونے لگتی تو ہم اپنے حافظہ پر زور دے دے کر تمام لطائف جو ہم نے زندگی بھر سنے ہوتے اپنے ان معتقدین کو سناتے اور ہم کو یہ دیکھ کر مسرت ہوتی کہ تمام مجمع ہنسی کے مارے لوٹا جا رہا ہے۔ اب مجمع کی آب و ہوا معتدل کرنے کے لیے ہم علامہ راشد الخیری کی ایک آدھ درد انگیز ناول کا پلاٹ بیان کر جاتے تا کہ ہنسنے والے یہ اندازہ کر سکیں کہ ہم کو صرف ہنسانا ہی نہیں رلانا بھی آتا ہے مگر یہ بھی آخر کب تک ہوتا۔ ہمارے ایسے نامی گرامی لیڈر کو کم سے کم ایک گھنٹہ تقریر کرنا ہوتی لہٰذا ہم اس وقت کو پورا کرنے کے لیے اپنی زندگی کے کچھ واقعات مثلاً اسکول اور کالج کے افسانے یا اپنے مختلف ریل کے سفر میں سے کوئی سفرنامہ سنا جاتے۔ بہرحال ہماری تقریر ان تمام نکات و رموز کے بعد جب ایک گھنٹہ میں ختم ہوتی تو ہم دیکھتے کہ حاضرین کا بہت تھوڑا مجمع باقی رہ گیا ہے۔ دراصل یہی پسماندگان ہمارے معتقد ہوتے اور انھیں کے سبب سے ہماری لیڈری

کے آئندہ چلنے کی امید باقی رہ جاتی۔ ہم ان حضرات کے نعرہ ہائے تحسین میں اپنی تقریر ختم کرتے اور اس کے بعد اپنے میز بانوں کے مشورے سے فوراً کسی دوسرے شہر یا گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اس لیے کہ ہماری تقریر سے بہت سے ہمارے دشمن پیدا ہو جاتے اور وہ ہم کو مسخرہ، بے تکایا، وہ گو وغیرہ کہہ کر گویا ہماری شان میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھے بہر حال ہم خود اس کا موقع نہ دیتے اور فوراً کسی اور طرف کا رخ کر کے روانہ ہو جاتے۔ ہر جگہ ہماری یہ آؤ بھگت ہوتی اور ہر جگہ ہماری تقریری مہارت اور جادو بیانی کا سکہ یوں ہی بیٹھتا اس سے زیادہ آخر آپ ایک لیڈر سے اور کیا چاہتے ہیں اور ایک لیڈر اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس لیڈری کا اتنا سخت معاوضہ دیا جائے کہ آدمی جیل تک چلا جائے۔ لیڈری کے لیے ہم بس یہی ایثار کر سکتے تھے کہ سوت نہ پہنتے، فیشن پرستی کو چھوڑ دیتے، اچھی خاصی صورت کو بگاڑ لیتے۔ سوائے لیڈری کے دنیا کے کوئی اور کام نہ کرتے تقریری مشق بڑھا لیتے۔ ایڈریس لینا اور ایڈریس کا جواب دینا سیکھ لیتے۔ کسی موافق یا کسی کے مخالف پروپگینڈہ کرنے کے گر معلوم کر لیتے۔ عوام کو معتقد بنانے کے ہتھ کنڈے یاد کر لیتے۔ مجمع کو ہنسا دینے اور مجمع کو رلا دینے کی قدرت اپنی تقریر میں پیدا لیتے شہر شہر اور گاؤں گاؤں تقریریں کرتے پھرتے اور ان تمام خدمات کے معاوضے میں صرف یہ چاہتے کہ ہم کو لمبے چوڑے قومی خطاب دیئے جاتے۔ اخبارات میں ہمارے چرچے ہوتے۔ گھر گھر ہمارا تذکرہ ہوتا۔ ہماری تصاویر کو لوگ قدر منزلت کے ساتھ دیکھتے۔ جب ہم گھر سے باہر نکلتے تو لوگ سر آنکھوں پر جگہ دیتے۔ ہمارا نام لے کر نعرے بلند کیے جاتے اور وہی تمام اعزاز ہم کو حاصل ہوتا جو ایک لیڈر کو حاصل ہونا چاہیے۔ رہ گیا یہ سوال

کہ ہم کھاتے کیا اور ذریعہ معاش کیا ہوتا۔ یہ اس لیے خارج از بحث ہے کہ ہم کو لوگ لیڈر سمجھ کر روپے کی تھیلیاں پیش نہ کرتے تو ہم فوراً لیڈری چھوڑ دیتے۔ اس لیے کہ روپیہ کی تھیلیاں نہ پیش کرنا دراصل ہماری توہین ہوتی اور ہم اس توہین کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور بغیر اس کے تو شاید ہم کو گھر سے بھی لیڈری کرنے کی اجازت نہ ملتی۔ لیڈری کرتے تو کیوں کر۔ یہ سچ ہے کہ ایک لیڈر کے لیے کسی وقت بھی کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی کمی نہیں رہتی اس لیے کہ اول تو وہ ساگ پات قسم کی غذا کھاتا اور کھدر قسم کا لباس پہنتا ہے۔ دوسرے اس کے معتقدین ہر وقت اس کو اپنے لیے باعث اعزاز سمجھتے ہیں کہ ان کا رہنما ان کے دستر خوان کو عزت عطا کرے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ رہنما غریب کے بال بچے بھی ہوتے ہیں اور وہ بغیر پیش کردہ تھیلیوں کے زندہ رہ ہی نہیں سکتے۔ رہنما اپنی زندگی تو بڑے مزے میں گذار سکتا ہے بشرطیکہ وہ مرنے کے بعد کچھ جائیداد اپنے پسماندگان کے لیے چھوڑ جانے کا گھریلو طور پر پابند نہ بنا دیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے تو تھیلیاں از بس ضروری ہوتیں۔ ایسی ضروری کہ شاید ہم اپنی لیڈری کی پہلی شرط انھیں تھلیوں کو قرار دے دیتے تا کہ ہمارے بعد ہمارے بچوں کو لیڈر وغیرہ بننے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

بہر حال یہ تمام مرحلے تو کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی جاتے مگر ہم نے ان لیڈروں کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں کہ ان کی ناک میں دم ہو جایا کرتا ہے اور وہ عجیب عجیب ترکیبوں سے ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مثلاً اپنے ہی معتقدین میں کسی وجہ سے اختلاف ہو جائے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو جائیں جلسوں میں ایک دوسرے پر شرم شرم کے نعرے بلند کرتے کرتے یہ لوگ ڈھیلے بازی سے جو ابتداء کرتے ہیں تو اکثر

پولیس کی فائرنگ پر ایسے جلسوں کی انتہا ہوا کرتی ہے۔ ایسی صورت میں لیڈر غریب کے لیے یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے کہ وہ کس کا ساتھ دے کس کا نہ دے۔ یہ مصیبت بحیثیت ایک لیڈر کے ہم پر بھی نازل ہوتی مگر ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اس قسم کے مواقع پر ہم ہمیشہ دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا لیا کرتے ہیں یا دروازے کے اوپر ایک تختی ٹانگ لیا کرتے ہیں کہ:-

"مکان برائے کرایہ خالی ہے"

یا سر پر پٹی باندھ کر لحاف کے اندر گھس رہتے ہیں۔ بہر حال ہم کچھ بھی کرتے مگر صاحب ہم سے تو یہ نہ ہوتا کہ ان ہنگاموں میں گھر کے باہر نکلتے اور بچوں سے کہہ جاتے کہ تم اپنے یتیم ہونے کا انتظار کرو یا گھر سے نکل کر لٹھوں کے زیر سایہ اسپتال پہونچ کر پھٹے ہوئے سر پر ٹانکے لگواؤ۔ اس قسم کے معرکوں میں ہماری لیڈری ہمیشہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ داخل کر کے رخصت علالت لے لیا کرتی اور ہم ان باتوں سے ہمیشہ دور رہتے۔ اسی طرح ان معرکوں میں بھی ہم سب کی نگرانی کے لیے پیچھے ہی رہتے جس میں پولیس وغیرہ سے کوئی مقابلہ ہو جاتا تاکہ ہمارے پیرو بھاگنے نہ پائیں۔ اس قسم کے موقعوں پر ایک سمجھ دار لیڈر ہمیشہ پیچھے ہی رہے گا۔ البتہ بھاگنے والوں میں لیڈر کو سب سے آگے رہنا چاہیے اور یہی ہم بھی کرتے تاکہ بھاگنے کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کر سکیں اور دراصل یہی وقت بھی ہوتا ہے رہنمائی کرنے کا۔ اوّل تو جہاں تک ہم سے ہو سکتا اس قسم کے مواقع پیدا ہی نہ ہونے دیتے کہ جان جوکھم میں پڑ جائے اور جینے کے لالے۔ لیکن اگر ناگہانی طریقہ پر اس قسم کا کوئی موقع آ جاتا تو ہم سب سے پہلے اپنی خیر مناتے۔ اس لیے کہ اگر ہم ہی نہ ہوتے تو ہمارے پیرو رہ کر کیا کریں گے۔ ہماری زندگی خود ہم کو اپنے لیے عزیز نہ ہوتی بلکہ اگر سچ پوچھیے تو ملک و قوم کے لیے عزیز ہوتی اور ہم زندہ رہنا محض اس لیے گوارہ کر لیتے کہ ہماری ضرورت ہماری قوم کو ہوتی ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا ایسا لیڈر بھلا موت سے کیا ڈرتا مگر چونکہ ہم لیڈر ہوتے لہٰذا اس قسم کی موت سے نہ ڈرنا ہی بُرا سمجھتے اور اپنے کو اپنی قوم کی امانت سمجھ کر جہاں تک ہو سکتا محفوظ رکھتے۔

مناثرہ انجمن بہارادب لکھنؤ ۳۸ء

لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کا وہ دور جس کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے فنی جذباتی اور افادی حیثیت سے ادب اردو میں کیا وجہ رکھتا ہے؟

اس سے قبل کہ میں مقررہ ادبی عنوان پر کچھ عرض کروں امید ہے کہ آپ مجھ کو اجازت دیں گے کہ میں ذرا اپنی جغرافیائی حیثیت بیان کردوں تا کہ آپ کو یہ معلوم ہو سکے کہ ایک تھانوی کیا ہوتا ہے کہاں ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے یعنی ایک تھانوی کو لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری کے اس دور میں جس کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے فنی، جذباتی اور افادی حیثیت سے کیا درجہ حاصل ہوسکتا ہے اس کو آپ بغیر جغرافیائی تشریح کے محض علم عروض کی مدد سے شاید نہ سمجھ سکیں البتہ جغرافیہ کے علاوہ اگر کوئی اور علم اس بات کو سمجھا سکتا ہے تو وہ علم ریلوے ہے یعنی ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر آپ کو یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ تھانہ بھون کہاں واقع ہے لکھنؤ سے وہاں تک کا کرایہ کیا ہے اور فنی جذباتی یا افادی حیثیت سے وہاں تک کس درجہ میں جانا چاہیے۔ بہر حال تھانہ بھون کوئی ایسی جگہ نہیں ہے۔ جس کی جستجو میں آپ کو واسکوڈیگاما بننا پڑے اور اب تو جب کہ آپ نے ایک تھانوی کو دریافت کرلیا ہے تھانہ بھون کا آسانی کے ساتھ پتہ چل جانا کوئی بات ہی نہیں آپ کیوں کسی جغرافیہ کی کتاب کی ورق گردانی کریں اور کیوں ان ڈبلو آر کا ٹائم ٹیبل خریدنے کے بجائے ای. آئی. آر کا ٹائم ٹیبل خرید کر اپنے

دام ضائع کریں۔ ہم خود ہی عرض کیے دیتے ہیں کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں برقی روشنی اور دو اسٹیشنوں والا ایسا قصبہ ہے۔ جس کو اگر آپ یو. پی اور پنجاب کی سرحد کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ یہ قصبہ دہلی سے جتنا قریب ہے لکھنؤ سے اتنا ہی دور ہے اور اسی اعتبار سے ایک تھانوی کا دہلوی ہو جانا جس قدر آسان ہے اسی قدر لکھنوی بننا مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ باوجود زندگی بھر لکھنوی رہنے کے یہ خاکسار آج تک نرا تھانوی بنا ہوا ہے حالانکہ نام کے ساتھ محض جینے کے لیے تھانوی لگا ہوا ہے ورنہ دراصل مرنے کے لیے یہ غلام خالص لکھنوی ہے۔ بچپن یہیں گزرا، جوانی اسی عروس البلاد اور بلاد العروس کی گلیوں میں کھوئی اور بدستور یہ سلسلہ جاری ہے اب امید ہے کہ اگر خدانخواستہ بڑھاپے کی نوبت آئی تو وہ بھی یہیں کی مساجد میں وظیفہ پڑھ پڑھ کر گذر جائے گا اور خاک عیش باغ کی کشش اپنے حدود سے نکلنے نہ دے گی مگر باوجود ان تمام ملکی حقوق کے یہ خاکسار اب تک غیر ملکی ہے ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری کے متعلق اس غیر ملکی کو لب کشائی کی جرأت بھی کرنا چاہیے یا نہیں مگر اجتماع میں بہت سے غیر ملکی اس ملکی بحث میں حصہ لے چکے ہیں لہٰذا ایک تھانوی کیوں پیچھے رہ جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے اس وقت تک کے متعلق کچھ عرض کرنا کم سے کم ہمارے بس کی بات نہیں اس لیے کہ اپنی پیدائش سے قبل کے واقعات پر روشنی ڈالنا ہمارے نزدیک کوئی انسانی فعل نہیں کہا جاسکتا پھر ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ پیدا ہوتے ہی ہم نے مشاعروں کی حاضری کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ پہلے تو شفا خانوں کی حاضری کو اپنا معمول بنایا اس کے بعد جب یہ طے کرلیا کہ زندہ ہی رہنا ہے تو اسکول اور کالج کی حاضری کو مشاعروں کی حاضری پر مقدم سمجھا۔ البتہ ۱۹۲۸ء سے مشاعرہ بازی اور مشاعرہ نوازی شروع کی ہے اگر آپ ۱۹۲۸ء سے بیسویں صدی کا آغاز

فرض کرلیں تو المکلف الخذمت مع خراشی کے لیے حاضر ہے ورنہ مابخیر شما بسلامت خانہ آباد دولت زیادہ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس دس سال کے اندر جو انقلابات فنی۔ جذباتی اور افادی حیثیتوں سے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر گزرے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان کو کم سے کم پوری ایک صدی میں گزرنا چاہیے تھا۔ آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ واقعی دس سال میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری دس سال پہلے کس درجہ میں تھی اور آج کس درجہ میں ہے۔

فنی حیثیت سے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ لکھنؤ اسکول کے شعراء نے بیسویں صدی کے آغاز سے اس وقت تک نہ تو کوئی جدید بحر دریافت کی نہ عروض میں کوئی اضافہ کیا۔ وہی مفعول فاعلات جو باوا آدم کے وقت سے چلا آرہا ہے اب تک قائم ہے اور اسی لکیر کے سب فقیر بنے ہوئے ہیں۔ مقررہ بحروں میں غزلیں کہتے ہیں اور وہ بھی زبان کے خاص اصولوں کے ساتھ۔ نہ کوئی جدید محاورہ نظم کرتے ہیں نہ ان کے اشعار میں کوئی نئی ترکیب ہوتی ہے اور نہ کوئی ایسی بندش جس کو زیر بحث دور کی ایجاد یا اس زمانے کی کسی ایجاد کا پرتو کہا جا سکے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترقیاں لکھنؤ اسکول کے علاوہ آخر کس اسکول نے کی ہیں اس کا جواب ہم آپ کو لکھنؤ اسکول ہی سے دیں گے مگر ذرا حیدرآباد تک ہٹ کر استاد السلطان حضرت جلیل کو آپ لکھنؤ اسکول سے باہر نہیں کہہ سکتے مگر چونکہ وہ حیدرآباد میں ہیں لہٰذا اپنے کو اس دائرہ سے باہر سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دل کے شیشے میں تصور نے جو کی صورت کشی
کاپیاں آنکھوں نے بھی لے لیں شبیہ یار کی

دراصل یہ ہونا چاہیے تھی بیسویں صدی کی شاعری! کیا کہ اس مشین گن کے دور میں بھی وہی تیر و تفنگ نظم کیے جائیں جواب کسی اسلحہ خانہ میں تو نہیں البتہ عجائب

خانوں میں نظر آتے ہیں۔ موٹروں کا زمانہ ہے اور اونٹ کا ذکر ہو رہا ہے۔ تار برقی اور ٹیلیفون سے دنیا فائدے اٹھا رہی ہے۔ مگر شاعری کی قسمت میں وہی مرنے کے بعد خط کا جواب لانے والا نامہ بر رہ گیا ہے جو گور غریباں میں آ کر چلائے کہ ؏

کس کس کو انتظار تھا خط کے جواب کا

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی سائنٹفک شاعری کی مثالیں جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے لکھنؤ اسکول سے باہر بھی مشکل ہی سے ملیں گی مگر سوال تو یہ ہے کہ آخر غزل کیوں کہیے جب کہ آپ کو معلوم ہو کہ ؎

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

نظم کہیے نا۔ جس میں آپ ہر اعتبار سے آزاد ہیں۔ نئی نئی بحریں ہوں گی انوکھے محاورے ہوں گے تازہ بتازہ ترکیبیں ہوں گی اور نو بہ نو بندشیں۔ اب دیکھئے نا کہ لکھنؤ اسکول کے علاوہ باقی تمام ہندوستان غزل گوئی چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہو چکا ہے اور ان نظموں میں بھی خوب خوب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس وقت کوئی نظم تو یاد نہیں مگر ان نظموں کا سانچہ یاد ہے لہٰذا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

تو برق مجسم ہے
تو بیش ہے تو کم ہے
اندازۂ پیہم ہے
خمیازۂ برہم ہے
اے وہ کہ تو ہی تو ہے
انداز شکیبائی
یہ انجمن آرائی

اے جنت بینائی
اے پربت صدرائی

اے وہ کہ تو ہی تو ہے

مفہوم کی جستجو نہ کیجیے معنی آفرینی سے بھی کام نہ لیجیے ترکیبوں کی صحت پر بھی غور نہ فرمایئے بلکہ یہ دیکھئے کہ کیا روانی ہے اور کیا موسیقیت۔ جوانی پھوٹی پڑتی ہے شباب رقص میں ہے جذبات عریاں ہوئے جاتے ہیں فضائیں زمزمے برسانے لگتی ہیں اور ماحول ایک عظیم الشان پیانو نظر آتا ہے کیا اس کو بھی آپ فنی حیثیت سے ترقی نہ کہیں گے؟ خیر یہ تو یہ اب تو ایک اور شاعری شروع ہوگئی ہے۔ جس کو آزاد شاعری کہتے ہیں۔ جس میں ردیف وقافیہ سے آزاد ہوکر شعر کہا جاتا ہے اور ہر شعر مادر پدر آزاد قسم کا ہوتا ہے۔ اس کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

میں تری جذبات کی دنیا میں آکر سوگیا
لوریاں دیتی رہی تیری جوانی بار بار
پھر جفاؤں نے تری مجھ کو جگایا رات بھر
تو مری انگڑائیوں کا رقص خود دیکھا کیا
میں نے بیداری میں اپنے خواب دیکھے بارہا
ہاں مگر تو ہی مرے ہر خواب کی تعبیر ہے

ان اشعار کو آپ ''مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ'' کہہ کر ہنس دیں گے حالانکہ ان ہی کا نام افکار عالیہ، جواہر پارے، حسن تخیل اور زمزمہ روح وغیرہ ہے۔

(۱) خیر اس کو بھی جانے دیجیے ہم تو زمانے کی رفتار یہ دیکھ رہے ہیں کہ عنقریب شاعری صرف اس طرح ہوا کرے گی کہ مشاعروں کے دعوت ناموں میں مصرع طرح کی جگہ یہ لکھ دیا جائے گا کہ ''طرح دو انچ تین سینٹی میٹر طویل قافیہ پیمانہ ردیف نہیں'' اور اسی طرح پر شعرائے کرام ناپ ناپ کر مصرع کہیں گے اور عروض کے پرانے اوزان کو چھوڑ کر جدید پیمانوں سے ان کے اشعار ناپے جائیں گے بلکہ کیا تعجب ہے کہ امریکہ کے سائنسداں شعر کہنے کی کوئی مشین بنا کر بھیج دیں کہ مصرع طرح اس مشین میں رکھا اور مطلع سے لے کر مقطع تک پوری غزل تیار۔ بہر حال اس سائینس کے دور میں وہ شاعری جو سائینٹفک اصولوں کے خلاف ہو ذرا مشکل سے کامیاب ہو سکتی ہے اور اس کو جھک مار کر کسی نہ کسی انقلاب کی زد میں آنا پڑے گا۔

مگر لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کو ان انقلابات کی بھی خبر نہیں بلکہ لکھنؤ اسکول کے شعراء بیسویں صدی کے کلام کو سن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ اب محض غزل ہی کہہ رہی ہیں گویا فنی حیثیت سے کوئی ترقی خود ان کو قبول نہیں کر سکتی البتہ فنی حیثیت کے ایک دوسرے رخ سے ترقی ضرور کی ہے اور وہ ترقی یہ ہے کہ اب تک تو عروض محض مسند اور تکیہ۔ قالین اور دری چاندنی وغیرہ تک محدود تھا مگر اب اس میں کرسیاں بھی شامل کر لی گئی ہیں شمع کی گردش کے بجائے شعراء کرام ڈائس پر جا کر کلام سننے کو اب تقطیع سے گرا ہوا نہیں سمجھتے حاضرین مشاعرہ کے تالی بجانے میں اب کوئی ذم کا پہلو نہیں نکلتا۔ حقہ کی جگہ سگار اور سگریٹ میں بھی تنافر نہیں پایا جاتا۔ دور کے بجائے اگر شعراء کو حروف تہجی کے اصول پر مرتب کی ہوئی فہرست سے پڑھوایا جائے تو اس میں بھی خفی یا جلی کسی قسم کا ایطا نہیں ہوتا محفوظ یہ کہ لکھنؤ اسکول کی ان ترقیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ جب ان فنی ترقیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ جب ان فنی ترقیوں کو اس فنی جمود کے دوش بدوش آپ رکھیں گے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس وقت تک لکھنؤ اسکول کی شاعری کو فنی اعتبار سے ڈیوڑھا درجہ حاصل ہے۔ اب رہ گئیں دو حیثیتیں جذباتی اور افادی جہاں تک جذباتی حیثیت کا

تعلق ہے ہمارے خیال میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا جب تک کہ لکھنؤ اسکول کے شعراء مشاعروں کی مقررہ طرح پر غزل کہنے کی عادی ہیں۔ مقررہ طرح مقررہ قوانی پر غزل کہنا کس طرح جذباتی شاعری ہوسکتی ہے قافیہ پیمائی کو جذباتی شاعری نہیں کہا جاسکتا جذباتی شاعری تو دراصل یہ ہے کہ طرح تو ہے ع

ذرہ ذرہ ترے کوچہ کا مرادل ہوجائے

اور جذبات سے مغلوب ہوکر شاعر یہ مطلع کہہ جائے کہ ؎

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں ٹھبکا نہیں

جذبات کو ردیف کی بیڑیاں اور قوافی کی ہتھکڑیاں پہنا کر آپ قید نہیں کر سکتے۔

(۲) اور نہ جذبات دراصل اس کے پابند ہوسکتے ہیں کہ وہ آپ کے فاعلاتن فاعلات کے حرف بحرف پابند رہیں بلکہ اگر سچ پوچھئے تو جذبات تو اس کی بھی پروانہ کریں گے کہ آپ کہاں پر موزوں رہے اور کہاں ناموزوں ہوگئے۔ جذباتی شاعری تو دراصل یہ ہے کہ ؎

تم تو کہتے تھے وہ آئیں گے نہیں
دیکھو وہ کیا چلے آتے ہیں دونوں ہاتھوں میں پر طاؤس لیے

آپ کے نزدیک یہ شعر یقیناً غلط ہوگا اور ہر اعتبار سے غلط ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی آپ کے اصول کے مطابق یہ شعر ذرا غلط ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جذباتی شعر ہے اگر آپ یہ کہیں کہ پہلا مصرعہ بہت چھوٹا اور دوسرا مصرعہ بہت بڑا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہی تو دراصل جذباتی شعر ہونے کی علامت ہے۔ شاعر جس وقت پہلا مصرعہ کہہ رہا تھا اس کے جذبات اسی قدر مختصر تھے جس قدر مصرعہ مختصر ہے اور جس وقت دوسرا مصرعہ نظم کیا گیا ہے اس وقت اس کے جذبات کا طول وہی تھا جو دوسرے مصرعہ میں آپ کو نظر آرہا ہے۔ دراصل شاعر نے عروض سے زیادہ اپنے جذبات کی پابندی کی ہے اور ہمارے نزدیک یہی جذباتی شاعری ہے۔ یا ایک اور شعر یاد آیا ؎

سر سے پا تک ہے کمر ان کی جو بل کھائی ہوئی
وہ نسلاً بعد نسلاً ولد ہوتے رہے

آپ اس شعر پر ہنس رہی ہیں اور آپ کی ہنسی ایک حد تک حق بجانب بھی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جذبات دراصل کسی کی موزونیت یا کسی ترتیب کے پابند ہو ہی نہیں سکتے۔ اس شعر میں تو خیر بے ربطی اور ناموزونیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے مگر ہم تو اس کو بھی مکمل جذباتی شعر کہنے کو تیار ہیں جس کا پہلا مصرعہ نظم میں ہو اور دوسرے مصرعہ کی جگہ محض مفہوم نثر میں لکھ دیا جائے۔ مطلب کہنے کا یہ کہ جذبات کو آپ قید نہیں کر سکتے اور جب آپ نے قید کر دیا تو جذبات بھی آپ کو وہ دھوکا دیں گے کہ آپ سمجھیں گے ان کو جذبات حالانکہ وہ ہوں گے محض مصرع طرح کے سائز کے شعر اور آپ کی موزونیت کے چند کرتب۔ مطلب کہنے کا یہ ہے جذباتی حیثیت سے تو لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کی شاعری کو کوئی درجہ ہی نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ بقول گاندھی جی کے کوئی فورتھ کلاس ہی نہیں ہے جس میں سفر کروں لہٰذا مجبوراً تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاتا ہوں۔

افادی حیثیت سے البتہ لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری نے حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں۔ مثلاً سب سے پہلی ترقی تو کرسیوں کی نشست ہے جس کا افادی پہلو یہ ہے کہ حاضرین کے جوتے محفوظ رہ سکتے ہیں حالانکہ چوروں کے نقطۂ نظر سے افادی پہلو ختم ہوگیا مگر حاضرین مشاعرہ کے نقطۂ نظر سے افادی پہلو دراصل اب پیدا

ہوا ہے یعنی اب جوتوں کی چوری کا محض اس وقت امکان ہے جب آپ پاپوش کے ساتھ صاحب پاپوش کو بھی غائب کریں ورنہ آنکھ سے سرمہ چرانا اور پیریس سے جوتا کھول لے جانا تقریباً یکساں ہے۔ دوسرا افادی پہلو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے سامعین مشاعرہ سوٹ پہننے لگے ہیں اور ان کے قیمتی سوٹ فرشی مشاعرہ میں اگر بالکل خراب نہ ہوں تو کم از کم پتلون کو تو شرعی پاجامہ ضرور بنا دیتے ہیں اور ان کی نشست کا زاویہ بھی کچھ بے ڈھنگا ہی سا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے سامعین سوٹ کی وجہ سے نماز کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی شرکت بھی چھوڑتے جاتے تھے۔ کہ کرسیوں کی نشست کا طریقہ معلوم ہوگیا اور اب ان سامعین کے سوٹ بالکل اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح سنیما میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ افادی پہلو بظاہر تو کچھ نہیں مگر اہل سوٹ کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے تو بہت کچھ ہے۔

تیسرا افادی پہلو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس وقت تک کے چند مایہ ناز شعراء مثلاً خیام العصر ریاضؔ خیر آبادی، لسان القوم مولانا صفیؔ اور حضرت ظریفؔ لکھنوی کے کلام کا مجموعہ شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب اردو کے ان گم شدہ اوراق کی ضرورت نہایت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے مگر اقتصادی تباہی کے اس دور میں اگر یہ مجموعے شائع کر دئے جائیں تو قدر دانان سخن اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر ان کو خریدیں گے اور افادی مقصد فوت ہو جائے گا۔

چوتھا سب سے بڑا افادی پہلو یہ ہے کہ فرشی مشاعروں میں ہر آنے والے شاعر کو شعراء سے لے کر سامعین تک جن مختلف زاویوں سے اٹھ اٹھ کر اور بیٹھ بیٹھ کر تعظیم دیا کرتے تھے اس سے پتلون تو پتلون اگر سچ پوچھئے تو پاجامہ تک کی سیونیں بعض اوقات چرچرا جاتی ہیں اور تعظیم دینے والے کو کان پکڑ کر اٹھا بیٹھی کا مزہ آ جاتا تھا اب اس کا بھی سد باب ہوگیا ہے اور کسی کو تعظیم دینے کے لیے صرف دو ہی زاویے باقی رہ گئے ہیں یعنی یا تو بخط مستقیم کھڑے ہو جاتے ورنہ زاویہ قائم بنے ہوئے بیٹھے رہے بلکہ پیروں کو زحمت دینے کے بجائے اظہار عقیدت کے لیے اب ہاتھوں سے کام لیا جاتا ہے کہ جس کو آسمان پر چڑھانا چاہا تو تالیاں بجا دیں اور بس نہ کھڑا ہونا، نہ بیٹھنا نہ ہاتھ جوڑنا نہ فرشی سلام کرنا اس میں شک نہیں کہ اس طرح ورزش کا ایک بہانہ ختم ہوگیا مگر ایک بہت بڑا افادی پہلو ضرور نکل آیا۔

فنی، جذباتی اور افادی تین حیثیتیں تو ختم ہو گئیں رہ گئیں باقی حیثیتیں وہ خارج از بحث ہیں۔ لہٰذا زیادہ حد ادب۔

غالبیات

مرزا غالب کے ایسے مسلم الثبوت استاد نے جو غزل ہفتوں کی کاوش کے بعد کہی ہوگی اس کی شرح یہ خاکسار محض چند صفحوں میں عرض کر رہا ہے۔ جس کے لکھنے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ صرف نہ ہوا ہوگا۔

اس سے قبل کہ شرح پیش کی جائے ضرورت اس کی ہے کہ ہم اخلاق وشرافت کے نام پر معذرت خواہی کریں تا کہ حشر کے دن دوسرے گریبان پکڑنے والوں میں مرزا غالب ایسے بزرگ نہ ہوں۔ لہٰذا سب سے پہلے معذرت ضروری ہے ملاحظہ فرمائیے اور گواہ رہیے کہ ہم معذرت خواہ ہو چکے تھے۔

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہ تھی انھیں
کچھ شرح لکھنا باعث عزت نہیں مجھے
آزار رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
غالب سے کیا کسی سے عداوت نہیں مجھے
میں شرح لکھ رہا ہوں شرف کچھ یہ کم نہیں
مانا، اسد کا مرتبہ شوکت نہیں مجھے

غالب پہ اور مجھ کو ہو تنقید کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
میرا مزاج آپ ہے جام جہاں نما
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں اور شرح لکھتا، مگر اس سے مدعا
جز ارتکاب ذوق ظرافت نہیں مجھے
یوں ہی سا اک مذاق تھا جو شرح بن گیا
دیکھا کہ چارہ غیر اشاعت نہیں مجھے
اس میں جو آپڑی ہو سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے ترک عقیدت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
حرکت تو یہ بُری ہے پہ نیت بری نہیں!
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول کا شوکت خدا گواہ
سچ بولتا ہوں گوکہ یہ عادت نہیں مجھے

اس معذرت کے بعد معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک بار سر سے اتر گیا اور اب شرح پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا لہٰذا ملاحظہ فرمائیے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

دھمکی سے مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک رنگروٹ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پہنچا۔ صاحب نے اس کو فوج کی ملازمت کے نشیب فراز سمجھا کر اس کی جرأت کا امتحان لینا چاہا اور ریوالور اس کے کوٹ کی آستین میں رکھ کر لبلبی دبادی۔ ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ گولی کوٹ کی آستین کو پار گئی مگر یہ جوان اٹینشن رہا۔ صاحب نے اس کی یہ جرأت دیکھ کر فوراً پروانہ تقرر دے دیا اور ساتھ ہی کچھ روپیہ دیا کہ اس کا کوٹ بنوا لو تمہارا کوٹ خراب ہوگیا ہے۔ رنگروٹ نے کہا اور حضور۔ پتلون کے دام۔ صاحب نے کہا۔ پتلون کیسا؟ رنگروٹ نے نہایت سادگی سے کہا۔ حضور وہ بھی تو خراب ہوگیا ہے۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب نے اپنے اس مطلع میں پیش کیا ہے کہ عشق کی جنگ جوئی کے لیے پتلون کے دام مانگنے والوں کی ضرورت نہیں بلکہ ان مردوں کی ضرورت ہے جو عشق و محبت کی نبرد آزمائی میں جنرل فرانکو ثابت ہوں۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے کے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

اس شعر میں صرف ایک لفظ ''کھٹکا'' ایسا ہے جس نے شعر کو ذرا پڑھے لکھوں کے سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے حالانکہ اگر اسی لفظ کو بدل کر یہ شعر یوں کہہ دیا جاتا تو کسی شرح کی ضرورت نہ تھی ؎

تھا زندگی میں موت کا پرزہ لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

یعنی موت کے بعد انسان کا رنگ زرد ہوتا ہے مگر میں نے زندگی ہی میں موت کا ایسا پرزہ فٹ کرا لیا جس کی وجہ سے زندگی میں رنگ زرد نظر آتا تھا۔ اور مرنے کے بعد تبدیلی رنگ کے جھگڑے سے نجات مل گئی۔ اب اس قسم کے پرزے شاید نہیں ملتے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندستان میں اس قسم کے باکمال انجینئر بھی تھے جو ایسے حیرت انگیز پرزے اور کھٹکے بنا لیا کرتے تھے۔ دوسرا شعر ہوا ہے ؎

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یہ شعر وہ ہے جس کا ایک عام فہم ایڈیشن کسی لوئر پرائمری شاعر نے پیش کیا ہے کہ ؎

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

یعنی بچے کے پیر پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ ابھی کمسن ہی تھا اور خیالات میں کوئی شعور بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ مجھ کو وفا کے طریقے سمجھنے اور وفا کیش بننے کا شوق پیدا ہوگیا اور عقل کی خامی کے زمانے میں بلوغ کی یہ علامات پیدا ہو چکی تھیں۔ اور سنیے فرماتے ہیں ؎

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اس شعر کو سمجھنے کے لیے ممکن ہے آپ اٹلس دیکھنا شروع کر دیں کہ دنیا کے نقشے میں دریائے خوں کہاں ہے مگر اس جستجو میں آپ کو کامیابی نہ ہوگی بلکہ اس شعر کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دل اور جگر کو اسپین کے دو پرفضا مقامات تصور کر لیجیے۔ اس کے بعد اسپین کی خونچکاں اور تباہ کن خانہ جنگی کو پیش نظر رکھ کر اس شعر کا مفہوم سمجھیے کہ اسپین کے ان دو مقامات کے درمیان جہاں آج خون کی موجیں نظر آتی ہیں پہلے وہ دل فریب منظر تھا کہ جلوۂ گل بھی اس کے سامنے بچہ نظر آتا تھا۔ شعر سنیے کیا خوب کہا ہے ؎

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

اس شعر میں جو مضمون مرزا صاحب نے پیش کیا ہے وہ اب تک پیدا ہونے والے تمام شعراء اپنے اپنے الفاظ میں کہہ چکے ہیں اور آئندہ آنے والے شعراء اس بات کا حلف وفاداری اٹھار ہے ہیں کہ اسی تخیل کو اپنے الفاظ میں ضرور ادا کریں گے خواہ پھر اس کو سرقہ سمجھا جائے یا اخلاقاً لوگ اس کو توارد کہہ دیں۔

بہر حال اس شعر کو وہ حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو بھوت پریت اور آسیب وغیرہ کے قائل ہیں۔ شاعر نے یہی کہا ہے کہ عشق وہ بلا ہے جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی چنانچہ سینہ سے دل تو نکل جاتا ہے مگر دل کا درد بھوت بن کر کراہتا ہے اور وہی اس آسیبی خلل میں مبتلا رکھتا ہے، جس کو عرف عام میں عشق کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کسی متروک شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا ملاحظہ ہو ؎

یہ محبت بھی کہیں اے بندہ پرور جائے ہے
جائے بھی ہے یہ تو عاشق کو مٹا کر جائے ہے

مگر ہمارا تو خیال یہ ہے کہ پہلے تو محبت کا بھوت عاشق پر سوار رہتا ہے اور جب عاشق بقول شاعر کے مٹ جاتا ہے تو وہ خود بھوت بن کر شاعروں اور افسانہ نگاروں پر سوار ہو جاتا ہے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے بھوت مورخین کے سر پر بھی سوار ہوئے ہیں۔ مقطع کے علاوہ آخری شعر بھی کیا خوب ہے ؎

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

احباب نے دیکھا کہ بے چارہ جنگلوں کی خاک اڑاتا پھرتا ہے دامن گریباں میں ہے اور گریباں دامن کے اشتراک عمل سے لنگوٹی کی قائم مقامی کے لیے تیاریاں کر رہا ہے۔ خط بڑھا ہوا ہے۔ ناخن البتہ جدید فیشن کے مطابق لمبے لمبے ہیں۔ پریشاں بالوں پر ایک دوسرا بیاباں نشو و نما حاصل کر رہا ہے سر کیا ہے جوؤں کی دنیا کا گلوب ہے۔ ڈارون کی بندر والی تھیوری میں انقلاب ہوا ہے اور اب معلوم ہوا ہے کہ انسان خواہ پہلے بندر رہا ہو یا لنگور مگر اس کا مستقبل یہ ہے کہ اگر عشق ہو گیا۔ اور عشق نے جنون کی کیفیت پیدا کی تو وہ ریچھ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بہر حال دوست کا یہ حال دیکھ کر دوست احباب یہی کر سکتے تھے کہ اس کو پکڑ کر جیل بھجوا دیں۔ دوستی کی یہ شان بظاہر دشمنی نظر آتی ہے مگر بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج ہی یہ ہے کہ دوا کے بجائے زہر دیا جائے۔ اسی قسم کے علاج بالمثل میں سے ایک علاج یہ بھی ہے کہ احباب جنگل سے اپنے سر پھرے دوست کو پکڑ لائیں اور جیل میں بند کر دیں تاکہ اس کا تحفظ ہو سکے اور وہ جنگلوں کی خاک نہ اڑائے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ زنداں میں بیٹھے ہیں۔ اور خیال ہے کہ بیابان کی خاک اڑا رہے ہیں۔ مگر اس خیالی بیاباں نوردی کے مضرت رساں تمام اثرات بھی خیالی ہی ہو سکتے ہیں۔ مگر عالم تصور میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک جھاڑی سے ہم اور دوسری جھاڑی سے ایک شیر نکلا۔ ہم ٹھہرے عاشق اور وہ بھی وحشی ہمارے لیے شیر ہو یا بھیڑ سب برابر ہیں۔ لہٰذا اس کو بھی اپنا محبوب سمجھ کر اس کی دم پر گندھی ہوئی چوٹی کا گمان کر کے جو ذرا چھوا تو اس قاتل نے جفا کاریاں شروع کر دیں۔ اور صرف نگاہوں کے تیر یا ابرو کے شمشیر سے زخمی ہی نہیں کیا بلکہ اپنے دست ناز سے پسلیاں چیر کر دل نکال لیا اور کھا گیا عاشق زار کو محض منھ کا مزہ بدلنے کے لیے۔ خیالی بیابان نوردی کا یہ خیالی واقعہ اگر خیالی نہ ہوتا بلکہ سچ مچ ایسا ہی ہوا ہوتا تو کس قدر افسوس کا مقام تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وحشی دوست کو زنداں میں رکھ کر خیالی صحرا نوردی سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ اس سلسلہ کے تمام افسوس ناک واقعات بھی خیالی ہی

ہوتے ہیں۔ اب مقطع سنئے اور ایک آہ بھرکر ذرا جھوم تو جائیے یا سر دھنیے یا کم سے کم زانو تو پیٹ ہی لیجیے۔

یہ لاش بے کفن اسدؔ جاں کہا ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آج کل آزادی کا مفہوم نئی روشنی کے مردوں اور عورتوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ آفتابی غسل ہوا کریں۔ مغربی ممالک میں تو بحالی صحت اور انحطاطِ غیرت وحمیت کے لیے اس قسم کے بہت سے کلب قائم ہیں۔ جن میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ لباس ایک قطعاً غیر ضروری اور غیر فطری چیز ہے۔ اور بغیر اس کے انسان زیادہ خوش۔ زیادہ بشاش۔ زیادہ ہلکا پھلکا زیادہ آزاد اور زیادہ فطرفریب رہنے کے علاوہ اخلاقی طور پر زیادہ مضبوط رہ سکتا ہے۔ اس کے دلائل بے شمار پیش کیے جاتے ہیں اور اگر انسان ان کے جوابی دلائل پر غور کرنے کی فکر تھوڑی دیر بھی نہ کرے تو یقیناً وہ بھی جامہ سے باہر ہوسکتا ہے خواہ کیسا ہی مقدس اور ستر پوش قسم کا انسان کیوں نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ لباس اگر کوئی ضروری چیز ہوتا تو انسان ماں کے پیٹ سے سوٹ پہنے ہوئے پیدا ہوتا مگر چونکہ انسان کے لیے فطرت نے عریانی ہی کو لباس بنایا ہے۔ لہٰذا انسان اگر برہنہ رہے تو اس کی زندگی ہر اعتبار سے پاکیزہ بن سکتی ہے اور ہر جھگڑے سے پاک ہوکر انسان اپنی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ نہ اس کی فکر کہ اس رنگ کے کوٹ پر اس رنگ کا پتلون پہننا جائز ہے اور اس قسم کا پتلون پہننا حرام مطلق۔ دن کے وقت اس قسم کی ٹوپی پہننا عین سعادت مندی ہے اور رات کے وقت یہی سعادت مندی انتہائی نالائقی ہوجاتی ہے۔ اس طرح کی ٹائی اس قسم کی قمیض پر باندھنا بغاوت ہے اور اس قسم کی باندھنا عین وفاداری۔ اس طرح کے سوٹ پر اس قسم کا جوتا ہونا چاہیے اور اس طرح کے جوتے کے اندر اس قسم کے موزے ہوں۔ کھانے کا کپڑا یہ ہے۔ اور ناچنے

کا یہ ڈنر کے جوتے یہ ہیں اور عام طور پر پہننے کے یہ۔ ٹینس کھیلنے کا شرٹ یہ ہے اور یہ گھوڑے پر بیٹھنے کا پاجامہ۔ مختصر یہ کہ ایک اچھا خاصا عذاب ہے اور تحریک عریانی کے مبلغین اس کو عذاب ہی ثابت بھی کرتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جب تک حضرت آدم نے دانۂ گندم استعمال نہ کیا تھا لباس کی ضرورت پیش نہ آئی تھی بلکہ وہ نہایت معصومانہ انداز سے اللہ کے نیک بندوں کی طرح برہنہ پھرتے تھے۔ مگر انھوں نے شیطان کے بہکانے سے شجر ممنوعہ کو خدا کے حکم کے خلاف چھوا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جنت سے نکالے گئے بلکہ بطور عذاب ان پر لباس بھی لاد دیا گیا۔ اور وہی لباس ایک مستقل جیل کی طرح ہر اولاد آدم کو گھیرے ہوئے ہے۔ گویا لباس وہ جیل ہے جس کو ہم اوڑھے ہوئے اور لپٹائے ہوئے طرح طرح سے سجا کر اور خوشنما بنا کر اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ اگر حضرت آدم نے گیہوں نہ کھایا ہوتا تو آج ہم کو بزاز، درزی، دھوبی کے جھگڑوں سے نجات مل جاتی اور اس سوٹ بوٹ کے بکھیڑے میں ہم نہ پھنستے۔ مگر اب متمدن ممالک کے مہذب اور روشن خیال باشندے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ باپ کے گناہ کا ذمہ دار بیٹا ہو اور اس کو بھی والد مرحوم کے گناہ کی پاداش میں سزا بھگتنا پڑے۔ لہٰذا اس زنجیر اسیری کو توڑ کر اب جامہ اور پاجامہ سب سے باہر ہوئے جاتے ہیں اور وہ زمانہ دور نہیں جب تمام مہذب انسان مادر زاد برہنہ نظر آئیں گے۔ اور وحشت اور بربریت کی علامت وہ لباس ہوگا جو آج تہذیب اور تمدن کا علمبردار بنا ہوا ہے۔ بہرصورت یہ بحث طویل ہے مگر مرزا غالب کے اس مقطع کو دیکھ کر یہ معلوم ہوکر بڑی مسرت ہوئی کہ اگلے زمانہ میں بھی عریانی آزادی کی علامت تھی اور جس جدت پر آج مغرب کو ناز ہے کہ ہم ہی نے عریانی کی ابتداء کی ہے وہ دراصل ہندوستان کا ایک پرانا رواج ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کا یہ مقطع شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی لاش کو بے کفن رکھا گیا ہے۔ کسی

مجبوری یا مصیبت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ یعنی زندگی یوں ہی آزادی میں گذاردی۔ غالباً آزادی سے مراد یہی آفتابی غسل وغیرہ ہے یا یہ کہ مرزا صاحب بھی اس سزا کے قائل نہ تھے۔ جو خود ان کے کسی جرم کے سلسلہ میں نہیں بلکہ ان کے مورث اعلیٰ کی پہلی غلطی کے سلسلہ میں ان پر عائد کی گئی تھی۔ بہرصورت لاش کا مرنے کے بعد بے کفن ہونا تو خیر وضعداری کی انتہا ہے مگر لاش کے اس طرح عریاں ہونے سے پہلے مصرعہ کی آزادی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ غالباً کسی عریاں تشریح کی محتاج نہیں۔ پھر یہ کہ ''حق مغفرت کرے'' کہنے کی ضرورت بھی اسی لیے پیش آئی ہے کہ مرزا نے اس اسیری کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا جو اولاد آدم پر نسلاً بعد نسل عائد چلی آتی ہے۔ اگر یہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی تھی تو خدا مغفرت کرے۔ بہرحال وہ تو آزاد مرد تھا اور عجب آزاد مرد تھا۔

شوہر کی جنت

بات یہ ہے کہ ہم نے بیگم کو ہمیشہ اسی بات کا یقین دلایا ہے کہ ہم کو کسی اور جنت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہماری جنت تو صرف آپ کی ذات ہے۔ مگر واقعات اس کے سراسر خلاف ہیں۔ جب کہ ہم کو تو مستقل طور پر یہ فکر ہے کہ اگر جنت میں ہمارا ساتھ ان ہی نیک بخت کا رہا تو آخر کیا ہوگا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

طالب علمی کے زمانے میں بورڈنگ ہاؤس کی زندگی بسر کرنے کا ہم کو پورا تجربہ ہے مگر قسم لے لیجیے جو بورڈنگ ہاؤس کے ایک قانون کو بھی صحیح سالم چھوڑا ہو۔ اسکول میں ماسٹروں سے مرعوب ہونا ہمارے نزدیک ہمیشہ ذلت کی بات تھی۔ البتہ ذرا ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھنٹہ میں تھوڑی دیر کے لیے دم سادھ کر بیٹھنا پڑتا تھا مگر اب تو یہ حال ہے کہ گویا ہیڈ ماسٹر صاحب ہی سے شادی کرلی ہے۔ کیا مجال کے بیگم صاحبہ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے پیدائشی حق یعنی آزادی سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ صبح دیر میں سو کر اٹھیں تو منحوس۔ منہ دھوئے بغیر چائے پی لیں تو اچھوت۔ دفتر دیر سے جانے کا ارادہ کریں تو کام چور نوالہ حاضر۔ جاڑے کا زمانہ اگر بغیر غسل کے ٹالنا چاہیں تو افیونی۔ تاش کھیلیں تو جواری۔ شطرنج سے دل بہلائیں تو نحوست کے

ذمہ دار۔ باہر گھومنے جائیں تو آوارہ گرد۔ رات دیر میں لوٹ کر آئیں تو اعلیٰ درجے کے بدمعاش۔ پتنگ اڑانے کا ارادہ کریں تو لوفر۔ اور اگر کچھ بھی نہ کریں یعنی خاموش بیٹھ کر اونگھیں یا منہ اٹھائے محض بیٹھے رہیں تو بیوقوف...... اب آپ ہی بتایئے کہ یہ زندگی ایک شوہر کی زندگی ہے یا کالے پانی کی سزا پانے والے کسی مجرم کی زندگی۔ مگر جیسی کچھ بھی زندگی ہے بہر حال اب تو اسی طرح اس کو بسر کرنا ہے۔ اس لیے کہ بیگم صاحبہ کا ساتھ کوئی ایک دو دن کا تو ہے نہیں بلکہ زندگی بھر کا ساتھ ہے اور زندگی ایک اتنی بڑی مدت کا نام ہے کہ اس کا تصور کرتے کرتے بھی اختلاج ہونے لگتا ہے۔

خیر یہ زندگی تو جس طرح بسر ہو رہی ہے ہو ہی رہی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ جنت میں کیا ہوگا۔ یعنی اگر ایک یتیم شوہر پر یہ تمام زیادتیاں کرنے کے باوجود بیگم بھی اس جنت میں گئیں جہاں ہمارا جانا اس جہنمی زندگی بسر کرنے کے بعد گویا یقینی ہے تو وہاں کیا ہوگا۔ اور وہاں سے کیوں کر ہم کو نجات مل سکے گی۔ مگر جہاں تک ہمارا خیال ہے ہماری جنت یقیناً ان خطرات سے پاک ہوگی۔ اور وہاں بیگم صاحبہ ہم کو اپنا شوہر بنا کر یوں نہ رکھ سکیں گی بلکہ وہاں ہم ٹانگیں پھیلا کر دن چڑھے تک سویا کریں گے۔ آفتاب کی شعاعیں ہمارے لحاف پر کھیلا کریں گی۔ مگر بیگم کی یہ مجال نہ ہوگی کہ لحاف گھسیٹ کر ہمارے کسی خواب کو نامکمل چھوڑ دیں اور ہم کو اندھیرے منہ نو دس بجے دن کو اٹھا کر بٹھا دیں۔ ہمارا جب تک جی چاہے گا سویا کریں گے چاہے ہفتوں سوتے رہیں یا مہینوں سو کر نہ اٹھیں۔ پھر یہ بھی کوئی ضروری بات نہ ہوگی کہ سو کر اٹھے تو منہ بھی دھوئیں ورنہ چائے نہ ملے گی۔ یہ تمام پابندیاں تو اس بیگم والی دنیا اور شوہرانہ زندگی تک ہیں۔ جنت میں تو ہمارا منہ اپنا ذاتی منہ ہوگا خواہ اس کو دھوئیں یا نہ دھوئیں اور چائے بے چاری کی تو خیر کیا مجال ہے کہ وہ اپنے لیے ہمارا منہ دھلوائے بلکہ جہاں تک چائے کا تعلق ہے وہ تو سوتے میں بھی ہم پی سکیں گے۔ اس لیے کہ چائے کی خواہش کو پورا کرنا ہمارا کام نہ ہوگا بلکہ یہ خود چائے کا فرض ہوگا کہ وہ وقت مقررہ پر ہماری اس طلب کو پورا کرے یعنی وہ خود ہی ہمارے معدے میں اپنی ذمہ داری کے ساتھ پہونچا کرے گی۔ مثلاً فرض کر لیجیے کہ ہم سو رہے ہیں تو محض چائے کے لیے بیدار ہونا اور اپنی نیند میں خلل ڈالنا نہ پڑے گا بلکہ چائے کا فرض ہوگا کہ وہ خود ہی بنے، بن کر کیتلی سے دم کھاتی ہوئی پیالی میں آئے۔ پھر وہ پیالی اس چائے کو لے کر ہمارے بستر تک دبے پاؤں آئے گی اور نہایت احتیاط کے ساتھ لحاف کے اندر پہونچ کر ہمارے لبوں سے لگ جائے گی تاکہ چائے اس پیالی سے نکل کر ہمارے لبوں سے ہوتی ہوئی آہستہ آہستہ حلق کے نیچے اتر جائے اور ہم کو خبر بھی نہ ہو۔ اسی طرح چائے کے ساتھ کا ناشتہ اپنے فرائض منصبی کو خود ہی محسوس کرے گا۔ مطلب کہنے کا یہ کہ یہ تو خیر ایک آدھ مثال تھی جو ہم نے پیش کر دی ورنہ عام طور پر تو یہ ہوگا کہ ہم خود کسی کام کے لیے کبھی مجبور نہ ہوں گے بلکہ ہر کام خود ہمارے لیے جنت میں مجبور ہوگا۔ اور کسی قسم کے کسی قاعدہ یا قانون کی پابندی ہم پر فرض نہ ہوگی بلکہ ہر قاعدہ اور قانون ہمارا پابند ہوگا۔

اب جاڑے کے زمانہ میں نہانے ہی کو لے لیجیے کہ بیگم ناک میں دم رکھتی ہیں۔ اور دسمبر یا جنوری کے زمانہ میں بھی ان کو ذرا بھی ترس نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو مر مر کے نہانا پڑتا ہے۔ لیکن جنت میں یہ ظلم ہم پر نہ ہو سکے گا۔ وہاں تو جب ہم چاہیں گے بغیر غسل کیے غسل کی تازگی اپنے اوپر طاری کر لیا کریں گے۔ خواہ وہ دسمبر اور جنوری کا زمانہ ہو یا مئی اور جون کا موسم اور جب یہ صورت ہمارے اختیار میں ہوگی تو اس کے بعد آپ ہی بتایئے کہ بلا وجہ غسل کرنا وقت برباد کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ بیگم ہمارے ان اختیارات کو دیکھیں گی اور تعجب کریں گی۔ اور صرف یہی کیا ان کو تو سب سے زیادہ چڑھ ہے ہمارے تاش کھیلنے سے۔ یہاں تک کہ گھر میں کبھی کوئی

تاش کا پیکٹ رہنے ہی نہیں پاتا اور اگر کبھی ہم نے تاش کی ایک آدھ بازی برس چھ مہینے کے بعد کھیل لی تو اتنے ہی دنوں تک اس کی جواب دہی بھی کرنا پڑتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ہر وقت طعنے سنتے ہیں۔ مگر جنت میں دیکھیں وہ کیسے کر منع کرتی ہیں۔ وہاں ہمارے اختیار میں ہوگا کہ جب چاہیں نظر بندی سے کام لے کر ان کی نظر باندھ دیں اور خود نہایت اطمینان سے تاش کھیلیں ہم تاش کھیلیں گے۔ اور وہ دیکھیں گی کہ ہم کوئی نہایت اہم مسئلہ لے کر چند عالی دماغوں کے درمیان سلجھانے کو بیٹھے ہیں۔ اسی طرح ہم شطرنج میں دن دن بھر مصروف رہیں گے اور ان کی سمجھ میں یہی آئے گا کہ ہم کوئی ہنگامہ خیز کتاب لکھ رہے ہیں۔ مگر آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک قسم کی چوری ہوئی اور چوری کی ضرورت پیش آئی بیگم سے مرعوب ہونے کے بعد لہٰذا جانے دیجیے اس نظر بندی اور سمجھ بندی کی ترکیبوں کو۔ مگر آپ کے پاس اس کا کیا علاج ہے کہ ہماری جنت کی آب و ہوا میں بیگم کے دماغ کی اصلاح اس حد تک ہوجائے گی کہ وہی تاش جس کا نام سن کر وہ آگ بگولہ ہوجاتی ہیں۔ جب ہم کھیلنا چاہیں گے تو بیگم نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ کہیں گی۔

''آپ نے تو تاش کھیلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں تو خود غور کر رہی تھی کہ آخر آپ کو تاش کی طرف کیوں کر متوجہ کیا جائے۔''

اور جب ہم تاش کھیل چکیں گے تو وہ پھر گلاب کی طرح شگفتہ ہو کر کہیں گی کہ ''ایک بازی اور کھیل لیجیے میری خاطر سے سہی دیکھئے آپ کو میری ہی قسم ہے۔'' رہ گئی شطرنج یعنی وہ منحوس کھیل جس کو کھیلنے کے معنی بیگم کے نزدیک یہ ہیں کہ گھر سے برکت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے، رحمت کے فرشتہ اس منحوس گھر کا راستہ بھول جائیں اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ گھر جس میں شطرنج کھیلی گئی ہو، اس طرح تباہ و برباد ہوجائے کہ بہار کے زلزلہ کی تمام تباہیاں عبرت سے اس گھر کا منہ دیکھیں۔ مگر اسی شطرنج کے لیے بیگم نہایت ہی اہتمام کریں گی۔ ہاتھی دانت کے مہرے بنوائیں گی۔ سنگ مرمر کی میز پر اس کی گنگا جمنی بساط ہوگی۔ اور مہروں میں یہ خوبی ہوگی کہ ہر مہرہ اپنا نام خود سمجھے گا۔ اور زبان سے نام لیتے ہی اپنی چال چلا کرے گا۔ بیگم ہم سے شطرنج کھیلنے کے تقاضے کیا کریں گی اور ہم بیگم سے آنکھ بچا کر ان کو میکے بھیج کر یا چھپ چھپ کر دوستوں کے یہاں شطرنج نہ کھیلیں گے بلکہ بیگم کے زیر اہتمام خود ان ہی کے ساتھ دن رات شطرنج ہوا کرے گی۔

گھومنے کے سلسلہ میں حال یہ ہے کہ بیگم چاہتی ہیں کہ ہم دفتر جانے سے پہلے اور دفتر سے واپسی پر بس ان ہی کی خدمت میں حاضر رہا کریں۔ وہ ڈلی کاٹتی جائیں اور اپنے پرائے آئے گئے محلّہ پڑوس والوں کے واقعات اور حالات کے سلسلہ میں بیکار دماغ چاٹیں اور ہم اپنے دماغ کو اس طرح بے عذر ان کے سامنے رہنے دیں گویا دماغ کیا ہے ''ماحضر'' ہے اور یہ سمجھ کر چپ رہیں کہ ع

روزئی خود میخورد برخوان تو

مختصر یہ کہ نہ کہیں سیر کو جائیں نہ گھر کے باہر قدم نکالیں۔ لیکن ہماری جنت میں ہم ہوں گے اور سیر سپاٹا۔ جہاں چاہیں گے، جائیں گے اور جب تک جی چاہے گا، گھومیں گے بلکہ اگر خود ہم نہ جائیں گے تو بیگم ہم کو گھومنے کے لیے بھیجا کریں گی کہ ''جائیے ذرا تفریح ہوجائے گی تازہ ہوا جسم کو لگے گی دماغ تازہ ہوجائے گا۔ اگر آپ تھک گئے ہوں تو سواری منگا دوں اس پر چلے جائیے۔ مگر جائیے ضرور۔'' گویا اب تو ہم باندھ باندھ کر رکھے جاتے ہیں۔ اور اپنی جنت میں گھیر گھیر کر گھومنے پھرنے بھیجے جائیں گے۔ ذرا ہماری جنت کا تصور تو کیجیے کہ کس قدر دلچسپ اور کیسی آزادی کی فضاؤں سے معمور جگہ ہوگی۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر کسی دن کسی حادثہ یا سانحہ کے سلسلہ میں یا کسی عمدہ فلم یا کسی جلسہ کے چکر میں چراغ جلنے کے بعد گھر آنا پڑا

تو بس یہ سمجھ لیجیے کی قیامت کا سامنا ہے۔ پھر لاکھ لاکھ سمجھائیے۔ خوشامد کیجیے منت سماجت سے کام لیجیے مگر یہ تو گویا طے ہی ہے کہ بدمعاشی کے خطاب سے نہیں بچ سکتے۔ اور محض یہ اتفاقی تاخیر ایسا سنگین جرم بن جاتی ہے جو قابل دست اندازی ہی نہیں بلکہ مچلکہ اور ضمانت سے بھی کچھ آگے ہی سمجھی جاتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کی تفریح جب تک ایک مستقل عذاب میں مبتلا نہیں کر لیتی۔ اس وقت تک گویا ہم کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ مگر ہماری جنت میں یہ نامعقول پابندیاں اپنے منحوس قدم بھی نہیں رکھ سکتیں۔ وہاں تو اگر ہر روز عید ہوگی تو ہر شب کو شب برات بننے کا حق بھی حاصل ہوگا۔ راتوں کی جوان تاریکیوں میں ہم اپنے جنتی احباب کو ٹہلایا کریں گے۔ وقت کا دھڑکہ ہمارے لطف کو کرکرا نہ کرے گا۔ بلکہ ہم آزاد ہوں گے کہ جب چاہیں گھر جائیں۔ چھ بجے شام کے بجائے سات بج جانا کیا معنی ہم تو بارہ اور ایک بجے رات کو بھی اگر گھر آئیں گے تو بیگم کو اپنے استقبال کے لیے خوش آمدید لکھی ہوئی شالباف پائیں گے اور وہ مسکرا مسکرا یہی کہیں گی کہ ”خدا کا شکر ہے کہ آج میرے سرتاج کا اتنا وقت دلچسپیوں میں گذرا اللہ اس سے زیادہ آپ کو بےفکریاں اپنے خزانہ غیب سے عطا کرے۔“ بیگم کے اس خلوص اور خیر مقدم سے ہمارا وہ تمام خون رگوں میں گردش کر جائے گا جو آج کل رات گئے آنے کے جرم میں ڈر کے مارے خشک ہو جاتا ہے۔

پھر ہم اپنی جنت میں اپنی گلاب سے زیادہ شگفتہ بیگم کو جو آج کل پھانسی کا حکم سنانے والے سیشن جج سے زیادہ خشک نظر آتی ہیں اپنی دلچسپیوں کی تفصیل سنائیں گے کہ یوں احباب میں لطف رہا۔ اور یوں ہاہا ہو ہو میں وقت کٹا اور بیگم جو اس دنیا میں احباب کا نام سن کر مشین گن کی صورت میں مشتعل ہو جاتی ہیں اور جن کی بددعاؤں سے ہمارے سیکڑوں دوست فائدہ اٹھا کر ع

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

کا سلسلہ بنے ہوئے ہیں وہی بیگم ہمارے ایک ایک دوست کا نام لے لے کر اس کے اور اس کے بال بچوں کو دعائیں دیں گی کہ ”یا اللہ اس شخص نے جیسا میرے شوہر کو آج خوش رکھا ہے تو بھی اس کو ایسا ہی خوش رکھنا اور اس کی اس نیکی کا بدلہ تو اس کے بال بچوں کو دینا۔“

پھر ہم ان سے اپنی ان تمام دلچسپیوں کا ذکر کریں گے جن کو اس دنیا میں وہ غیر شریفانہ باتیں، شہدہ پن۔ آوارہ گردو غیرہ کہا کرتی ہیں مگر ہماری جنت میں ان ہی تمام باتوں کو وہ ہماری شرافت۔ ہماری نیکی اور ہماری نیک چلنی کی علامتیں سمجھیں گی۔ خدا کی پناہ اگر آج کل ہم گھر جا کر یہ کہنے کے بجائے کہ ”ہم وعظ سن رہے تھے۔“ کہیں یہ کہہ دیں کہ ”آج سینما میں ایک مشہور گانے والی کا گانا سن کر آرہے ہیں۔“ تو یقین جانئے کہ ایسی خبر لی جائے کہ پھر خود بھی سرگم الاپنا پڑے۔ مگر یہی بیگم جنت میں ایسی جنتی ہو جائیں گی کہ ہم خود ہی ان سے کہیں گے کہ ”آج ایک حور نے ایسا لاجواب گانا سنایا کہ واہ واہ! سچ تو یہ ہے کہ جیسی وہ حسین تھی ویسی ہی حسین آواز بھی پائی ہے۔“

بیگم مسکرا کر کہیں گی۔ ”اللہ اس حور کا بھلا کرے جو میرے شوہر کو اس قدر پسند آئی۔“

کیوں صاحب ہم پوچھتے ہیں کہ ہم کو تو خیر چھوڑیئے ہمارے حال پر۔ مگر ہمارے علاوہ بھی ہے کوئی اپنی بیوی کا شوہر جو اس دنیا میں کسی حسین سے حسین عورت کو اپنی بدصورت سے بدصورت بیوی کے سامنے حسین کہہ کر بیوی کے قہر و غضب سے بچ جائے۔ اور ہے کوئی ایسی بیوی اس دنیا کے پردہ پر کسی شوہر کی زوجیت میں جو اپنے شوہر کی پسندیدہ عورت کو اس طرح بیساختہ دعائیں دے۔ مگر یہ صرف ہم ہوں گے اور جنت میں ہماری جنتی بیگم جن سے اس قدر خوشگوار تعلقات ہوں گے۔ وہ خوشگوار

تعلقات جن کے بغیر یہ دنیا جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ جب ہم اپنی بیگم سے کہیں گے کہ ''بیگم وہ حور ایسی تھی کہ تمہاری ایسی سینکڑوں بیویاں اس پر قربان کردی جائیں۔'' تو بیگم بجائے چلنے کے نہایت اشتیاق کے ساتھ کہیں گی کہ ''میرے سرتاج آپ کے انتخاب پر قربان ہو جانا میرا اور آپ کی سینکڑوں بی بیوں کا فرض ہے۔'' بیگم کے الفاظ پر ہم جھوم جائیں گے اور آخر ان سے کہہ دینا پڑے گا کہ ''اے وفا کی دیوی جنت کی تمام حوریں تجھ پر قربان۔'' بیگم کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو ہوں گے اور ہمارے دل میں بیگم کی دہشت نہیں بلکہ طوفانی محبت۔ یہ ہوگی ہم غریباں مئوشوہر کی جنت۔

شوہر یا ایڈیٹر

ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ ہم ایک شوہر ہیں اور ہم اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ہم ایک ایڈیٹر ہیں۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کے نزدیک ہم صرق شوہر ہیں اور اخبار کے ڈائریکٹر صاحب مجھکو محض ایڈیٹر سمجھتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ بیگم صاحبہ اور ڈائریکٹر صاحب دونوں اپنی جگہ پر ایسے مستحکم دلائل رکھتے ہیں کہ اب میں خود اس فکر میں ہوں کہ دراصل میں ایڈیٹر ہوں یا شوہر؟ اور اگر صرف ایڈیٹر ہوں تو شوہر کیسے ہو سکتا ہوں؟ اور شوہر ہوں تو ایڈیٹر کیوں کر بنا ہوا ہوں؟ یعنی ع

اگر نہیں ہوں تو کیوں اور ہوں تو کیا ہوں میں

بیگم صاحبہ کا دعویٰ یہ ہے کہ میں دراصل شوہر ہوں اور ایڈیٹر محض ایک معاشی ذریعہ ہے۔ یعنی وہ یہ کہتی ہیں کہ اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا تو بھی شوہر ضرور ہوتا۔ یعنی معاشی حیثیت سے تو یہ ممکن تھا کہ اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا۔ تو فلم ایکٹر ہوتا۔ فلم ایکٹر نہ ہوتا تو بڑھئی ہوتا۔ بڑھی نہ ہوتا تو زردوز ہوتا۔ مختصر یہ ہے کہ سب ہی کچھ ہو سکتا تھا مگر شوہر ہونا برحق تھا۔ اور بحیثیت ایک شوہر کے میرے لیے یہ ناممکن تھا کہ میں کچھ اور ہو سکتا یعنی کچھ ہوتا یا نہ ہوتا مگر شوہر تو ہونا ہی پڑتا۔ لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ شوہر ہونا اصل حقیقت ہے اور یہ ایڈیٹری محض ایک ضمنی حیثیت ہے۔ ان مستحکم دلائل کے بعد اب ڈائریکٹر صاحب کے دعوے کو ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بھی اپنی جگہ پر ایک ناقابل انکار

استحکام کا حامل ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ شوہر ہونا تو گویا ایک نجی اور گھریلو بات ہے مگر اس خاکسار کی عملی اور ذمہ دارانہ حیثیت یہ ہے کہ یہ خاک بسر ایڈیٹر ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میری شوہرانہ حیثیت میری ایڈیٹرانہ حیثیت کی منت پذیر ہے یعنی اگر میں ایڈیٹر نہ ہوتا تو جس آسانی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کا شوہر بن گیا ہوں نہ بن سکتا یہ تو ممکن تھا کہ میں ان بیوی کا نہ سہی کسی اور بیوی کا شوہر بن جاتا۔ اور شوہر ہونے کے لیے کسی خاص کاوش کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ ع

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

گویا یہ تو ایک ایسی معاملت تھی جو بغیر ہاتھ پیر ہلائے بھی ممکن تھی۔ مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جو شخص ایڈیٹر ہونے والا ہوتا ہے وہ دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو یعنی جو دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا وہ ایڈیٹری کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس بے روزگاری کے دور میں بے روزگاروں کی جس قدر سرپرستی صحافت نے کی ہے شاید ہی کسی اور شعبہ نے کی ہو۔ مختصر یہ کہ ڈائریکٹر صاحب کے نزدیک شوہرانہ حیثیت واہیات ہے۔ البتہ ایڈیٹرانہ حیثیت ہی صرف میری واحد حیثیت ہے۔

ڈائریکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ کے اس اختلاف خیال کے بعد خود ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ حیثیتیں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہیں اور کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر فرق یہ ہے کہ ایڈیٹری حیلہ روزی ہے اور بیوی بہانہ موت، اب یہ سمجھئے کہ اگر روزی اور موت دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش برحق ہیں تو ایڈیٹرانہ حیثیت اور شوہرانہ حیثیت کا اجتماع ضدین بھی انگیز کرنا ہی پڑے گا۔ اور دونوں کی اہمیت کا ایک ہی سانس میں اعتراف کرتے ہیں بن پڑے گا۔ خیر وہ تو عورت ذات ہیں ان کا کیا سوال جبکہ ڈائریکٹر صاحب کا ایسا جہاندیدہ مرد ہماری شوہرانہ حیثیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اور ان دونوں کی ناسمجھی نے اس خاکسار من ابتدائے شوہر لغایت ایڈیٹر کو عجیب دوعملی میں مبتلا کر رکھا ہے اور روز بروز اب تو یہی خیال دماغ میں جڑ پکڑتا جاتا ہے کہ خدا جس کو ایڈیٹر بنانے والا ہو اس کو اپنی قدرت کاملہ کے صدقہ میں شوہر نہ بنائے۔ اور اگر شوہر بنانا مشیت ایزدی ہی ہو تو اس شوہر کو خواہ کچھ بنادے ایڈیٹر نہ بنائے۔ مگر ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ دعا مقبول بھی ہوگئی تو آئندہ نسلوں کے کام آئے گی۔ ہم آخر کیا کریں جو بیک وقت شوہر بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی۔

اخبار کا دفتر ایڈیٹر بن کر بیٹھنے کی جگہ ضرور ہوتا ہے مگر ایڈیٹری کرنے کی جگہ قطعاً نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ وہاں تو صبح سے شام تک ایڈیٹر صاحب سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جو قدم بوسی۔ اذیّت کوشی اور دماغ نوشی کے لیے برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کوئی صاحب محض شرف نیاز حاصل کرنے کے لیے چلے آئے۔ کسی صاحب سے گھر میں لڑائی ہوئی تو غم غلط کرنے کے لیے ایڈیٹر صاحب پر نازل ہوگئے۔ کسی صاحب کو کسی لیڈر کی کوئی بات بری معلوم ہوئی تو ایڈیٹر سے باز پرس کرنے کے لیے آموجود ہوئے۔ کوئی صاحب جنرل فرانکو سے ناراض ہو کر ایڈیٹر کو ڈانٹنے آرہے ہیں۔ تو کوئی کسی ملکی تحریک سے بدعقیدہ ہو کر ایڈیٹر کو چیلین دینے کے لیے آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اخبار کا دفتر میں ایڈیٹر کا کمرہ تو گویا ''خانہ انوری'' ہوتا ہے کہ ہر بلا جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اسی کا پتہ پوچھتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ادارت کے تمام فرائض تو گھر کے کسی خاموش گوشہ میں بیٹھ کر انجام دیئے جائیں اور دفتر میں محض ایڈیٹر بن کر بیٹھا جائے۔ ڈائریکٹر صاحب بھی یہی چاہتے ہیں اور خود ہمارا خیال بھی یہی ہے۔ مگر گھر کا حال یہ ہے کہ دن بھر کے بعد جب ہم دفتر سے گھر پہونچتے ہیں تو بیگم صاحبہ ہمارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ سمجھتی ہیں۔ اور سیاسیات میں الجھے اور تھکے ہوئے دماغ کو گھریلو معاملات اور خاندانی مناقشات

سے علاقہ کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم تو بیٹھے قلم دوات لے کر تحریک وحدت العرب پر ایک زبردست لیڈنگ آرٹیکل لکھتے اور انھوں نے بکمال محبت تشریف لا کر فرما لیا۔

"کیا اس وقت بھی کچھ لکھنا ہے؟"

ہم نے ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پانیر کے صفحات میں منہ چھپا کر کہا "ہوں۔" مگر چونکہ ان کو اس "ہوں" سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا زور دیتے ہوئے دریافت کیا۔ "بھائی جان کو کوئی خط لکھئے گا۔ میرا اسلام بھی لکھ دیجیے گا اور سلمان کو بھی پوچھ دیجیے گا۔"

ہم نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ "اچھا لکھ دیا جائے گا۔"

بیگم نے اس خیال سے کہ شاید ہم وحدت العرب بھائی جان کو خط لکھتے ہوئے سلمان کو پوچھنا نہ بھول جائیں۔ مزید تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے ان کا خط آئے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔ بے حد خفا ہوں گے اور خفگی کی بات بھی ہے۔ اب ان کا آخر ہے کون جو کچھ بھی ہیں آپ ہی ہیں۔ اور آپ کا یہ حال ہے کہ یہ کمبخت دفتر سر اٹھانے کی مہلت نہیں دیتا۔ ایسی بھی کیا نوکری کہ آدمی دنیا کے کام ہی کا نہ رہے بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔"

بیگم کے ان الفاظ کی آواز تو بیشک کانوں میں جا رہی تھی مگر معنی اور مفہوم سمجھنے کے لیے دماغ کا جو حصہ مخصوص ہے اس میں ایران، افغانستان، ترکستان، عراق اور البانیہ وغیرہ بسے ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم نے یکایک چونک کر کہا۔ "متحدہ محاذ کی ضرورت ہے۔"

بیگم نے حیرت سے کہا۔ "کس چیز کی ضرورت ہے؟"

ہم نے اپنے ہوش میں آ کر کہا۔ "ایں کیا کہا؟"

بیگم نے ہنس کر کہا۔ "اے واہ خود ہی کچھ کہا اور خود ہی سوال کر رہے ہیں۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ بھائی جان کو خط ضرور لکھ دیجیے گا۔ اور اس میں یہ بھی لکھ دیجیے گا کہ باجی نے جس فراک کی پیمائش دی تھی۔ وہ درزی نے کھو دی ہے۔ اب شہر بانو کی ناپ پھر سے بھیج دیں تو اچھا ہے اور ہاں یہ بھی لکھئے گا کہ قوام پہونچا یا نہیں......"

وہ خط کا مضمون بتاتی رہیں اور ہم پھر اخبار پڑھتے پڑھتے ان کی طرف سے غافل ہو کر طہران اور استنبول پہونچ گئے۔ اللہ جانے انھوں نے کیا کیا کہا ہوگا کہ یکایک ان کے آخری الفاظ کہ "میل جول رکھنے سے میل جول رہتا ہے۔" دماغ میں اس طرح گونجے کہ ہم نے بھی الفاظ کی پوری قوت کے ساتھ کہا۔ "بیشک اتاترک اور رضا شاہ کو اس وقت بیدار ہونا چاہیے۔"

بیگم منہ کھول کر رہ گئیں اور ہم نے ان کو دیکھ کر اپنی اس گمشدگی اور از خود رفتگی کا احساس کرتے ہوئے ہنس کر کہا "نہیں سمجھیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت اخبار کا کام کر رہا ہوں۔ اور آپ ہیں کہ خدا جانے کیا ارشاد فرمائے جاتی ہے۔"

بیگم نے جل کر کہا۔ "چولھے میں گیا اخبار۔ ہر وقت اخبار۔ ہر وقت اخبار۔ اخبار نہ ہوا جان کا عذاب ہو گیا۔ اب آپ اخبار ہی اوڑھا اور اخبار ہی بچھایا کیجیے۔"

ہم نے گھر میں پھوٹ پڑتے ہوئے دیکھ کر وحدت العرب کے مسئلہ کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا اور بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "سنئے تو سہی۔ میرے خیال میں آپ نے آج تک یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں ایڈیٹر ہوں اور ایک ایڈیٹر ہر وقت اڈیٹر ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں تو وہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا جب کہ اس کے دماغ میں کوئی مقالۂ افتتاحیہ کروٹیں لے رہا ہو۔ چنانچہ اس وقت ایڈیٹوریل لکھنے والا ہوں۔ دماغ میں وہی خیالات بھرے ہوئے ہیں اور آپ خدا جانے کیا فرما رہی ہیں۔ میں ذرا یہ مضمون لکھ لوں تو بسر و چشم تعمیل حکم کروں گا۔"

بیگم نے سمجھنے کی کوشش کرنے سے گویا صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں یہ پوچھتی ہوں کہ جب گھر پر بھی آپ کو کام کرنا پڑتا ہے تو آخر دفتر کی حاضری کیوں ضروری ہے؟ اور اگر دفتر کی حاضری ضروری ہے تو گھر پر آخر آپ کیوں کام کرتے ہیں؟ کیا آپ چوبیس گھنٹہ کے ملازم ہیں اور گھر والوں کا کوئی حق آپ پر نہیں ہے کہ دو گھڑی گھریلو معاملات پر بھی کوئی بات چیت ہو سکے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’بیگم یہ بات نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دفتر میں آنے جانے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ وہاں یکسوئی کے ساتھ کچھ لکھا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا وہاں تو صرف لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں اور معمولی معمولی کام انجام پاتے ہیں۔ مگر ایڈیٹوریل نہایت اہم چیز ہوتا ہے اور اس کو لکھنے کے لیے پوری یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ اہم کام گھر کے لیے اٹھا لاتا ہوں غالباً اب آپ سمجھ گئی ہوں گی۔‘‘

بیگم نے کہا۔ ’’سمجھ تو گئی مگر صحت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ آخر دماغ کو کسی وقت آرام کی ضرورت ہے یا نہیں؟‘‘

ہم نے کہا۔ ’’ضرورت تو ہے مگر اس وقت آپ لکھ لینے دیں اس کے بعد اس سلسلہ میں بھی یکسوئی کے ساتھ تبادلۂ خیال ہو جائے گا۔

بیگم صاحبہ نے ہمارا رخ لکھنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اچھا آپ لکھئے مگر روز روز کا یہ جھگڑا ٹھیک نہیں ہے۔‘‘

بیگم صاحبہ تو خیر یہ کہہ کر چلی گئیں اور ہم نے موقع غنیمت جان کر جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن ابھی تمہیدی فقرے بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ بڑے صاحبزادے اپنا کوک کا موٹر لیے ہوئے تشریف لائے اور اس میں کوک بھر کر ہمارے کانوں کے پاس جو اس کو چھوڑا ہے تو معلوم یہ ہوا کہ حکومت ترکیہ کا کوئی ہوائی جہاز عین ہمارے کان کے اندر گر پڑا ہے۔ ہم یکا یک چونک پڑے اور ہمارے اس چونکنے پر صاحبزادے کو ایسی تفریح ہوئی کہ وہ قہقہہ بلند کرتے ہوئے ہماری گود میں آ گرے اور اس وقت ہماری سمجھ میں آیا کہ ہم دُول اسلامیہ کے متحدہ محاذ پر نہیں بلکہ غریب خانہ میں ہیں۔ اور یہ جو کچھ واقعہ ہوا ہے وہ میدان جنگ میں نہیں بلکہ گھر ہی پر بندہ زادہ کے ہاتھوں ہوا ہے لہٰذا اس کو ڈانٹ کر کہا۔ ’’کیا کرتے ہے۔ یہ کیا شرارت ہے؟‘‘ صاحبزادے نے کہا۔ ’’آپ سمجھے ہوں گے کہ ریل گاڑی کان میں گھس گئی۔‘‘

ہم نے بدستور غصہ میں کیا۔ ’’بھاگ جاؤ یہاں سے بدمعاش ہم کام کر رہے ہیں۔‘‘

صاحبزادہ نے کہا۔ ’’اچھا تو پیسہ دیجیے۔‘‘

ہم نے غصہ میں کہا۔ ’’جاؤ یہاں سے نہیں تو کان لیتے ہیں ہم تمہارے، بیوقوف کہیں کا۔‘‘

صاحبزادے نے وحدت العرب کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے مچل کر کہا۔ ’’پیسہ دیجیے‘‘ ایسے ضدی بچوں سے خدا بچائے۔ اب بتائے کہ اس وقت ہمارا کیا حال ہوگا۔ جی چاہتا تھا کہ ان صاحبزادے کو سر سے اونچا اٹھا کر دے ماریں یا خود اپنی بوٹیاں نوچیں۔ غصہ میں جلبلا کر ہم نے قلم تو رکھ دیا اور اٹھ کر صاحبزادہ کا کان جو پکڑتے ہیں تو انھوں نے اپنے دہانہ کو پوری وسعت کے ساتھ کھول کر وہ فلک شگاف نعرۂ احتجاج بلند کیا ہے کہ مسئلہ وحدت العرب تو خیر دماغ سے نکل ہی گیا مگر بیگم صاحبہ کے خلاف جو محاذ اتفاقی طور پر تیار ہو گیا تھا۔ اس نے دماغ کو اور بھی پریشان کر دیا کہ اب اگر وہ آ گئیں تو کیا جواب دیں گے۔ چنانچہ جو خطرہ تھا وہ پورا ہوا یعنی صاحبزادے کی آواز سن کر وہ آ موجود ہوئیں اور آتے ہی ہم سے پوچھا۔ ’’یہ

کیوں رویا؟“

ہم نے کہا۔ ”اسی سے پوچھئے کہ اس کو کس نے رلایا ہے۔“

بیگم تے بغیر اس سے پوچھے ہوئے کہا۔ ”اس سے کیا پوچھوں آخر آپ بتاتے کیوں نہیں۔“

ہم نے ایک اقراری مجرم کی طرح کہا۔ ”اس نے خود ہی ضد کی اور خود ہی مچل گیا۔ اب جو میں نے پیار کرنے کے لیے اٹھایا تو لگا رونے۔“

صاحبزادے نے حلق پھاڑ کر کہا۔ ”پیار کب کیا۔ ہمارے کان پکڑ کر مروڑ دیئے۔“

بیگم نے ہماری صورت دیکھی تو ہم کو ہنسی آ گئی۔ بیگم نے اس کو اعتراف جرم سمجھتے ہوئے کہا۔ ”کیا اچھے معلوم ہوتے ہیں آپ کہ بچوں سے لڑتے ہیں۔ اب آپ ہی اس کو منایئے۔“

ہم نے اپنے ایڈیٹوریل کی طرف سے صبر کرتے ہوئے کہا۔ ”منا تو رہے ہیں یہ لکھنے بھی تو نہیں دیتا۔“

بیگم نے کہا۔ ”ہاں تو آخر کب تک لکھنے دے۔ دن بھر تو آپ کو دیکھتا نہیں ہے اور اس وقت بھی آپ آتے ہیں تو کونے میں منہ ڈالے ہوئے لکھ رہے ہیں آخر اس کا بھی تو کچھ حق ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بہتر ہے۔ اس حق کی جس طرح کہیے ادائیگی کروں۔“

صاحبزادہ نے خود ہی کہا۔ ”ہم کو گھمانے چلئے گا۔ نہیں تو ہم سے دوستی نہیں ہو سکتی۔“

ہم نے ایڈیٹوریل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”چلو بازار چلیں۔“

اب آپ ہی بتایئے کہ اس وقت تو ایڈیٹوریل یوں رہ گیا۔ اور بیوی بچوں کی نذر ہو گیا۔ دوسرے دن جو دفتر پہنچے تو حسب معمول ملنے والوں ہجوم پایا۔ اب جو ایڈیٹوریل کو مکمل کرنے کے لیے چپراسی سے کہا کہ کسی کو کمرے میں نہ آنے دو تو ڈائریکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا آج گھر پر ایڈیٹوریل نہیں لکھا تھا؟“

ہم نے کہا۔ ”کیا بتائیں صاحب خانگی جھگڑے اور بیوی بچوں کے قصے مہلت نہیں دیتے۔“

ڈائریکٹر صاحب نے ان جھگڑوں کو معمولی سمجھتے ہوئے کہا۔ ”آپ بھی ان گھریلو باتوں کو اہمیت دیتے ہیں یہ سب قصے تو ہوا ہی کرتے ہیں۔“

ہم جلے ہوئے تو تھے ہی لہٰذا ان سے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”خدا کرے آپ کی شادی ہو اور ان جھگڑوں سے آپ کو پالا پڑے۔“

ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ ”شادی کیا پھر سے ہو گی۔ شادی تو ہو چکی ہے اور بیوی بھی وطن میں ہے مگر یہ جھگڑے وگڑے کچھ نہیں ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”ہاں تو ملاح در چین کشتی در فرنگ، جھگڑا کیا خاک ہو۔“

ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ ”آپ بھی میری پیروی کریں۔ اور بال بچوں کو وطن پہونچا دیں نا۔“

اب بتایئے کہ اگر یہ مشورہ بیگم سن پائیں تو کیا ہماری ایڈیٹری اور یہ ملازمت رہ سکتی ہے۔ وہ فاقہ کشی کر لیں گی مگر یہ نوکری نہ کرنے دیں گی۔ جس میں بیوی کو وطن میں رکھنے کے مشورے دیئے جاتے ہوں۔

حادثات

۳۷ء ہمارے لیے مبارک و مسعود ثابت ہوا یا نامبارک و منحوس اس کا فیصلہ محض حادثات کی تفصیل سننے کے بعد آپ خود کر لیں گے۔

ہم خود اپنی زبان سے کیا کہیں۔ اس سال کے پہلے مہینہ کا پہلا ہی ہفتہ تھا کہ عزیز از جان ٹائیگر کو کھانسی شروع ہوئی اور اس کھانسی کی اطلاع ہم کو اس وقت ہوئی جب کہ مرض اپنے ابتدائی مدارج طے کر کے استحکام کی منزل تک پہونچ گیا تھا۔ ہم ٹھہرے ملازمت پیشہ آدمی صبح اٹھ کر دفتر چلے جاتے تھے۔ اور شام کے قریب اس طرح تھکے ماندے گھر پہونچتے تھے کہ خود اپنا ہوش نہ ہوتا تھا۔ رہ گئیں بیگم انھوں نے ٹائیگر غریب کو ہمیشہ ایک کم حقیقت کتا سمجھا۔ اور اس کی محبت کی کبھی قدر نہ کی۔ ان کے نزدیک ٹائیگر کی بیماری گویا کوئی بات ہی نہ تھی لہٰذا وہ بھلا کیوں ذکر کرتیں۔ آخر ایک روز ہم نے خود ٹائیگر کو مضمحل دیکھ کر بیگم سے پوچھا۔ ’’یہ ٹائیگر آج کچھ پژمردہ سا نظر آرہا ہے۔ آخر کیا بات ہے؟‘‘

بیگم نے ناک بھوں چڑھا۔ ’’کر کہا! کھانسی ہوگئی ہے کمبخت کو؟‘‘

ہم نے محسوس کیا کہ گویا کسی نے کلیجہ پر گھونسہ مارا اور تڑپ کر پوچھا کب سے کھانسی ہے اس کو۔

بیگم نے لاپروائی سے کہا۔ ’’اب مجھے دن تو یاد نہیں ہے ہاں کوئی سات آٹھ روز سے کھانسی ہوگئی ہے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’اور نہ کوئی دوا نہ کوئی پرہیز۔‘‘

بیگم نے تنفر سے کہا۔ ’’یہ چوچلے آپ ہی کو آتے ہیں۔‘‘

ہم نے واقعی متفکر ہو کر کہا۔ ’’یہ مرے گا یا جئے گا۔‘‘

بیگم نے جل کر کہا۔ ’’مرے موا یا جئے میں کیا جانوں۔‘‘

ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ رفیقۂ حیات کی اس سرد مہری نے ہمارا دل توڑ دیا۔ خدا جانے ٹائیگر نے جب یہ الفاظ سنے ہوں گے تو اس غریب کے احساس کو کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔ بہرحال ہم نے ٹائیگر کو چمکار کر بلایا اور اس کا طبی معائنہ جس حد تک خود کر سکتے تھے کیا۔ وہ یقیناً کمزور ہو گیا تھا اور اس کے تنفس میں ایک خاص قسم کی تشویش انگیز کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھیپھڑوں کی آواز بھی صاف نہ تھی اور دل کی حرکت بھی کبھی اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ گویا سول سروس کپ کی ریس ہے اور کبھی اس قدر سست کہ گویا۔

ایک کچھوے کے آگئی جی میں
کیجیے سیر و گشت خشکی میں

بہرحال ٹائیگر کی یہ حالت دیکھ کر ہم کو سخت تشویش پیدا ہوگئی اور رات جوں توں گذار کر صبح ہی ہم اس کو لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہونچے اور ان کو مریض کا تمام حال سنا کر خوب اچھی طرح معائنہ کرایا۔ اس کے بعد ان کے مجوزہ نسخہ کو نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کرانے لگے۔ انتہائی پرہیز بھی ہوتا رہا اور تیمارداری میں بھی کوئی کسر ہم نے اٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ دو ایک روز کی رخصت بھی ہم کو لینا پڑی۔ مگر غریب ٹائیگر کا وقت آچکا تھا لہٰذا ع

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اور آخر کار ہمارے ٹائیگر نے ہم کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ ٹائیگر آنجہانی بظاہر ایک کتا تھا مگر اس کا شجرہ ہمارے پاس محفوظ ہے جو اصحاب کہف کے کتے سے تو خیر نہیں ملتا تھا مگر وہ ایک نجیب الطرفین گرے ہاونڈ ضرور تھا۔ اور ہم سے جو خاص محبت اس کو تھی اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اس وقت بھی اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم رہی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے کھڑا ہوا اپنی دم کی جنبشوں اور اپنی کمر کی لطیف لچک کے ساتھ زبان نکالے ہوئے ہانپ ہانپ کر اعلان خلوص کر رہا ہے۔ اب اس کی گردن کا پٹا اس کی زنجیر اور اس کے کھانے کے برتن دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ گھر بغیر اس کے ویران نظر آتا ہے کان اس کی آواز کے لیے ترس کر رہ گئے ہیں وہی آواز جس سے پہلے تمام گھر گونجا کرتا تھا۔

-x-x-

ٹائیگر کا داغ اٹھائے ہوئے ابھی مشکل سے ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ خدا جانے کون ظالم ہماری بائیسکل غائب کر لے گیا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ گویا ہمارے پیروں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ آہ کیا زمانہ تھا وہ بھی ہم اپنی گمشدہ بائیسکل پر ادھر سے اُدھر فراٹے بھرتے ہوئے نظر آتے تھے مگر اب ہم ہیں اور بائیسکل کی تلاش میں پاپیادہ کوچہ نوردیاں۔ ڈھونڈھتے تھک چکے ہیں۔ اور تھکنے کی بات بھی ہے کہ بائیسکل کو پیدل ڈھونڈھا جائے۔ ہم تو خیر اس کے ملنے کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے پولیس کے اس سائیکل اسٹاف کو جو برابر ہم کو بھی تلقین صبر کر رہا ہے کہ بائیسکل ضرور مل جائے گی۔ البتہ یہ طے نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں ملے گی یا اس کے بعد بہرصورت ایک موہوم سی امید ہے جو زندگی کی سہارا بنی ہوئی ہے ورنہ یقین جانئے کہ جب بائیسکل پر سوار ہو کر لوگ ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ خدا جانے اب ہماری بائیسکل کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کو ہماری اس بیقراری کی خبر بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال ہماری دعا تو یہ ہے کہ وہ جہاں بھی ہو خوش ہو۔ اور خدا اس کو تمام آفات ارضی وسماوی اور تمام امراض ٹیوب وٹائر سے محفوظ رکھے۔ دراصل اس کی گمشدگی کے سلسلہ میں غلطی ہماری ہی تھی کہ ہم نے اس کی کبھی قدر نہ کی اور ہمیشہ بغیر قفل کے نہایت ناقدری کے ساتھ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ کسی قدرداں نے اس کو دیکھ لیا اور اپنی عزت وآبرو کو خطرہ میں ڈال کر اس کو لے اڑا۔ ظاہر ہے کہ وہ ہم سے زیادہ مستحق تھا ورنہ بائیسکل کے لیے اپنے کو قابل دست اندازی پولیس ثابت نہ کرتا۔ مگر سچ کہا ہے کسی نے کہ انسان کچھ کھو کر پاتا ہے چنانچہ اب رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ ایک مرتبہ ہماری گم گشتہ بائیسکل مل جاتی اور ہم قفل ڈالنے کے تمام ارمان جی بھر کر پورے کر لیتے۔ مگر آہ اب وہ کہاں! کاش ہماری بائیسکل کے کان ہوتے وہ سن سکتی اور ہم نہایت درد بھری آواز کے ساتھ اپنا فسانۂ فراق ان کو سناتے کہ ؎

تمہارے جانے سے کیا ہم پہ بے کلی نہ ہوئی
گئی ہو جب سے یہاں صبح و شام بھی نہ ہوئی

نتیجہ دیکھ لو کوچہ نوردیوں کا ذرا
وہ درد پیر میں اٹھا کہ پھر کمی نہ ہوئی

عجیب دردِ محبت ہے جو ہے ٹانگوں میں
اذیّت ایسی ہوئی ہے کہ جو کبھی نہ ہوئی،

تمہارے ہجر میں پیدل جو اب گزرتی ہے
ہماری موت ہوئی یعنی زندگی نہ ہوئی

یہ ڈر ہے ہوکے رہے گا اب ہم پہ جرمانہ
کہ وقت پر کبھی دفتر کی حاضری نہ ہوئی

عدم کی راہ بھی پیدل تو ہم سے ہوگی نہ طے
وگرنہ زیست کا کیا تھا ہوئی ہوئی نہ ہوئی

بائیکلوں کے اس اغوا کے سلسلہ میں اگر لکھنؤ کی پولیس لاہور کی پولیس کی تقلید کرتی تو شاید آج ہم کو یہ دکھڑا نہ رونا پڑتا اور ہمارے پیروں پر یہ بیوگی کا عالم طاری نہ ہوتا۔ لاہور کی پولیس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں اس نے کوئی بغیر قفل کی بائیسکل رکھی ہوئی دیکھی فوراً اس میں پنکچر کر دیتی ہے۔ پنکچر سے مختلف فائدے ہیں۔ اوّل تو یہ لاپروائی کی ایک سزا ہے اور غیرت داروں کے لیے نہایت کافی انتباہ، دوسرے بائیسکل چوروں کی ہمت بھی ذرا مشکل سے ہوسکتی ہے کہ وہ پنکچر شدہ بائیسکل کو گھسیٹ کر لے جائیں۔ بائیسکل پر بیٹھ کر بھاگ جانا دوسری بات ہے مگر بائیسکل کو اپنے اوپر سوار کر کے بھاگنا ذرا مشکل کام ہے۔ مختصر یہ کہ ہم کو لاہور پولیس کا یہ طریقہ اس قدر پسند آیا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ مستقل طور پر بغرض رفاہ عام بائیسکلوں میں پنکچر کرتے پھرا کریں تاکہ ماجور بھی ہوں اور مصاب بھی۔

-x-x-

ٹائیگر اور بائیسکل کے بعد واد دیجیے ہماری سخت جانی کو کہ ہم ایک تیسرا داغ بھی اس ایک دل پر کھائے ہوئے زندہ بیٹھے ہیں۔ اور خدا جانے ابھی اور کیا کیا صدمے ہماری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ ٹائیگر کی موت اور بائیسکل کے اغوا نے دل و دماغ کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے کہ اگر ہم غم غلط کرنے کی کوشش نہ کریں تو خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لہٰذا دل بہلانے اور ہر وقت کی غم آگینی کو دور کرنے کے لے شامتِ اعمال ایک مشاعرہ منعقد کر بیٹھے شاعرہ آپ کی دعا سے بے حد کامیاب ہوا۔ مگر مشاعرہ کے اختتام پر معلوم ہوا کہ غزل خواہ کسی کی مقبول ہوئی ہو مگر جوتا ہمارا مقبول ہوا تھا یعنی اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہر طرف پہلے تو اس کو ڈھونڈھا اور آخرکار جوتہ سے ہاتھ دھو کر بیٹھ رہے۔ معلوم نہیں کہ جوتہ کی رعایت سے ہاتھ دھونا زیادہ صحیح ہے یا پیر دھونا بہرحال اس مسئلہ پر کوئی اہل زبان روشنی ڈالے گا ہم تو صرف اہل پاپوش ہیں۔ بہرحال اپنے جوتے کو حاصل مشاعرہ سمجھنے کے بعد ہم صبر کر کے بیٹھ تو رہے مگر آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ جوتوں اور مشاعروں کا مسئلہ روز بروز اہمیت حاصل کرتا جاتا ہے۔ اور ضرورت اس کی ہے کہ مفکرین وقت اس طرف اپنی توجہ مبذول کریں کہ مشاعروں کی وجہ سے جوتے یا جوتوں کی وجہ سے جوتے یا جوتوں کی وجہ سے مشاعرے کیونکر چھوڑے جاسکتے ہیں۔ حال یہ ہے کہ مشاعروں میں شعراء اور سامعین کے علاوہ ایک خاص جماعت اپنے بوسیدہ جوتے بغرض تبادلہ پہن کر تشریف لاتی ہے۔ اس جماعت کے افراد اپنے بوسیدہ جوتے چھوڑ جاتے ہیں اور جس کسی کا نیا جوتا پیر میں ٹھیک آجائے پہنتے ہیں اور سر پر پیر رکھ کر بھاگتے ہیں۔ شرکائے مشاعرہ تو شعر سن سن کر جھومنے اور داد دینے میں مصروف رہتے ہیں اور وہاں بے خبری کے عالم میں یہ معاصرانہ تبادلہ تکمیل کو پہونچ جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے جوتہ کی گمشدگی کا افسانہ یہ ہے کہ وہ غریبا مئو قسم کا جوتا نہیں ہے بلکہ وہ جوتا جوڈنر کے لباس کے ساتھ پہنا جائے۔ اس کو ہم نے لب فرش چھوڑ دیا اور خود

انتظامات میں مصروف رہے یہاں تک کہ جب آدھی رات کو مشاعرہ ختم ہوا اور ہم کو جوتے کی ضرورت پیش آئی تو معلوم ہوا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ چپکے چپکے ہر ایک کے پیر پر نظر ڈالی اور آخر مایوس ہو کر ایک ایک کا منھ دیکھنے لگے مگر نہ کسی کے پیروں میں جوتے کا پتہ چلا اور نہ کسی کے چہرے پر جوتے کے آثار نظر آئے۔ لہٰذا ہم اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔

جب سب لوگ جا چکے تو ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ایک گملے کے پیچھے کوئی نہایت خوفناک قسم کا جانور دانت نکالے ہوئے بیٹھا ہے۔ ہم نے دوڑ کر بندوق اٹھالی تاکہ اس جانور کے مہلک حملہ سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں مگر قریب جا کر دیکھا تو دراصل ایک جوتا تھا جو ہمارے جوتے کے نعم البدل کے طور پر ہم کو ملا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو جوتا کہنا یا جوتا سمجھنا ہی ایک قسم کی زیادتی ہے ورنہ وہ تو جوتے سے زیادہ طاعون زدہ چوہا، مگر مچھ کا بچہ، ہاتھی کا نوزائیدہ لخت جگر یا پھولا ہوا مینڈک معلوم ہوتا تھا۔ گھسی ہوئی ایڑی کے بعد پھیلا ہوا پنجہ اور بگڑی ہوئی ٹو کے ساتھ ہی آگے کے ٹانکے اس خوش سلیقگی سے کھلے ہوئے تھے کہ گویا گینڈے کو بیساختہ ہنسی آ گئی ہے اور ٹوٹی ہوئی ڈوریوں سے جیبھ اس طرح نکلی ہوئی تھی کہ گویا گرمی کی شدت سے کوئی کتا زبان نکالے ہوئے ہانپ رہا ہے۔ یا گیدڑ منہ چڑھا رہا ہے یا کسی بھوکی بلی کے منہ سے کسی نے چوہا چھین لیا ہے۔ ہم نے الٹ پلٹ کر اس جوتے کے پہلے تو بغور دیکھا اس کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر اس کو بجنسہ عجائب خانہ میں صرف یہ لکھ کر رکھوا دیا جائے کہ ”یہ ایک جوتا ہے“ تو دیکھنے والے اس کو حیرت سے دیکھیں گے۔ اور تعجب سے کہیں گے کہ اگلے زمانے میں بھی لوگ کیسے کیسے جوتے پہنا کرتے تھے۔ بہرحال ہم نے اس جوتے کو نہایت احتیاط کے ساتھ پھنکوا دیا تاکہ اور میونسپلٹی والے اس جوتے کو دیکھ کر ہمارا چالان نہ کر دیں۔ خیر ہمارا جوتا تو گیا مگر سوال یہ ہے کہ آخر مشاعروں کو جوتا چوروں سے کیوں کر محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ حاضرین مشاعرہ کا محض شرکت مشاعرہ کے لیے برہنہ پا ہو جانا ناممکن ہے اور مشاعروں میں فرشی نشست بھی ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ کرسیوں پر تو مشاعرہ، مشاعرہ نہیں بلکہ راؤنڈ ٹیبل کانفرس کا اجلاس نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر کوئی ایسا حل دریافت کیا جائے جو مشاعروں اور جوتوں کی اہمیت کو مساوی حیثیت سے ملحوظ رکھے۔ مال عرب پیش عرب والا طریقہ بھی اچھا تھا۔ بشرطیکہ لوگ برہنہ پائی کے مقابلہ میں پاپوش بدست ہونا پسند کر لیتے۔ مگر اس کو عام طور پر اپنی توہین سمجھا جاتا ہے کہ اپنے جوتوں کی حفاظت کی جائے۔ ایک صورت یہ ہے کہ لوگ مشاعروں میں ایسے جوتے پہن کر آیا کریں جو وہ نوکروں کو دینے والے ہوں یا جن کو اس لیے اٹھا رکھا ہو کہ برسات میں پہنیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جوتے کوئی نہ چرائے گا اور اگر ایسے جوتوں کو بھی کوئی لے گیا تو اس چوری کا صدمہ نہ ہوگا۔

مگر مشاعروں میں بن ٹھن کر شرکت کرنے والے اس کو بھی گوارا نہ کریں گے کہ ان کے پیروں پر پائے طاوس کا شبہ ہو۔ آخر کار گھوم پھر کر اسی نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ لب فرش جوتے اتارنے کی رسم ہی اڑا دی جائے اور لوگ اپنے جوتے پہن کر بیٹھا کریں۔ تاکہ اگر چور چرائے تو جوتے کو اس کے مالک کے ساتھ چرائے ورنہ حسرت سے اچھے سے اچھا جوتا پیر میں بندھا ہوا دور سے دیکھے اور دیکھ دیکھ کر رہ جائے جوتا پہن کر فرش پر محفل میں بیٹھنا بدتمیزی تو ضرور ہے مگر اس بدتمیزی سے نجات مل جاتی ہے جو جوتا کھونے کے بعد ایک خفت کی صورت میں جوتا کھونے والے پر اس طرح طاری ہوتی ہے کہ گویا آپ نے جوتا

کھویا نہیں بلکہ کسی کا جوتا چرایا ہے۔

-x-x-

ان تینوں حادثات کی تفصیل آپ سن چکے اب آپ ہی بتائیے کہ جس شخص کا کوئی سال اس قسم کے پیہم حادثات سے شروع ہوا ہو اس کا حال سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ؎

منحصر مرتے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

بابو

بابو ہندوستان کی اس مخلوق کو کہتے ہیں جو دفاتر میں فائلوں کی چہار دیواری کے درمیان ناک کی پھنگی پر عینک لگائے ہوئے کاغذ سیاہ کرتی ہوئی نظر آئے۔ اور اس کے متعلق دیکھنے والے کو نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ ہو سکے کہ سائنس داں نے اپنے کمال سے ٹائپ کی طرح خط شکست لکھنے کی یہ انسانی صورت والی مشین ایجاد کی ہے جو پان بھی کھاتی ہے اور عینک بھی لگاتی ہے۔ کبھی کبھی بات بھی کرتی ہے اور اکثر گھورتی بھی ہے۔ اور واقعی اگر بابو کی زندگی کا جائزہ لیجیے اور اس کے پروگرام پر غور کیجیے تو آپ کو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ انسان تو خیر برائے نام ہوتا ہے ورنہ زیادہ تر اس کے مشاغل مشین سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ روزانہ مقررہ وقت پر دفتر آنا۔ دفتر آ کر ایک ہی قسم کے کام کو روزانہ انجام دینا مقررہ وقت پر دفتر سے جانا اور ایک مقررہ نظام کے ماتحت گھریلو زندگی بسر کرنا۔ عام انسانوں کی طرح بابو کی زندگی میں مختلف قسم کے مدوجزر بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی دنیا کے صرف دو گرے ہوتے ہیں۔ گھر اور دفتر، دفتر اور گھر اور یہ دونوں گرے ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بھی بن کر رہ جاتے ہیں یعنی بابو کا گھر دفتر کے سہارے قائم رہتا ہے اور دفتر گھر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر بابو کو گھر کی فکر نہ ہو تو دفتر کی ہرگز پروانہ کرے اور اگر دفتر نہ ہو تو گھر کا خدا ہی حافظ ہے۔ مگر باوجود اس ربط کے بابو کی گھریلو اور دفتری زندگی میں

ایک مستقل تضاد ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر زیادہ گہرائیوں میں جایئے تو اس تضاد میں بھی آپ کو یکسانیت کی جھلک نظر آئے گی۔ بلکہ اگر بابو سے پوچھئے تو شاید وہ گھبرا کر گھر کو دفتر یا دفتر کو گھر کہہ جائے۔ اس لیے کہ اس بے چارے کی زندگی حصۂ مساوی جن دو حصوں میں تقسیم ہوئی ہے ان میں سے ایک کو وہ گھر کہتا ہے اور ایک کو دفتر۔ اور ان دونوں جگہوں کی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں اس پر کچھ اس طرح ہوتی ہیں کہ اس کو جلدی سے گھر اور دفتر میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ غور کرنے کے بعد وہ بتا سکتا ہے کہ دفتر اور گھر دونوں میں گھر کون سا ہے اور دفتر کون سا۔

بابو نے اسی غلط بحث سے بچنے کے لیے دفتر اور گھر میں چند موٹی موٹی پہچانیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لی ہیں تاکہ گھر اور دفتر میں آسانی کے ساتھ امتیاز ہو سکے۔ مثلاً گھر پر بوائن ہوتی ہیں اور دفتر میں صاحب۔ گھر پر بچے ہوتے ہیں اور دفتر میں اس کے دوسرے ہمعصر بابو۔ گھر پر کہار ہوتا ہے اور دفتر میں چپراسی۔ گھر پر کھانے کو ملتا ہے اور دفتر میں کھایا پیا ایک کیا جاتا ہے۔ گھر پر لیٹا جاتا ہے اور دفتر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ گھر پر نون تیل لکڑی کی فکر ہوتی ہے اور دفتر میں کیش بک، اکاؤنٹ بک اور لیجر کی فکر۔ گھر پر دھوتی باندھی جاتی ہے اور دفتر میں دھوتی کے اوپر ایک شرعی پاجامہ نما پتلون۔ گھر پر حقہ یا ناریل پیا جاتا ہے اور دفتر میں آنکھ بچا کر بیڑی۔ گھر پہ بچے پریشان کرتے ہیں اور دفتر میں اہل معاملہ اور اہل غرض حضرات۔ گھر پر بیوی کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے اور دفتر میں بڑے بابو یا چھوٹے صاحب کی۔ ان چند موٹی موٹی پہچانوں میں سے ایک بابو نہایت آسانی کے ساتھ بتا سکتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے گھر پر یا دفتر میں۔ دفتر میں یا گھر پر۔ بابوؤں کی سیکڑوں قسمیں ہوتی ہیں اور بھانت بھانت کے بابو اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ مگر ان سب کی زندگی کم و بیش ملتی جلتی ہوتی ہے اور ان سب کے حالات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ خواہ وہ ڈاک بابو ہوں یا تار بابو۔ ٹکٹ بابو ہوں یا کسی اور قسم کے بابو مگر ان سب کے حالات زندگی صرف یہ ہوتے ہیں کہ دفتر میں کثرت کار اور گھر پر کثرت اولاد۔ دفتر میں ترقی کی فکر اور گھر پر بوائین کے تقاضے سے لڑکی کی شادی کا غم۔ دفتر میں بڑے بابو کا اندیشہ اور گھر پر رام چرن کی مہتاری کا خطرہ۔ دفتر میں اہل معاملہ کے سامنے شیر اور بڑے بابو کے سامنے بھیگی بلی اور گھر پر بچوں کے باپ اور بچوں کی ماں کے صاحبزادے۔ گھر پر مہاجن سے قرض لینے کی فکر اور دفتر میں پہلی تاریخ کے لیے دن گننا۔ مختصر یہ کہ ایک بابو کی تمام سیاست تمام قابلیت اور تمام اہلیت کا دائرہ محدود ہے۔ گھر اور دفتر کے درمیان اس کے علاوہ خواہ دنیا میں کچھ ہو اس کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کی بلا سے اسپین کی حکومت تبدیل ہو جائے اس کو تو بڑے صاحب کی تبدیلی کی خبر بھی بالکل عین وقت پر ہوتی ہے۔ ہر ہٹلر کے ارادے کیا ہیں۔ اس پر وہ غور کرے جس کو بڑے بابو کے ارادوں کے سمجھنے سے فرصت ہو۔ جدید دستور کے نشیب و فراز اس کے نزدیک مہمل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ دفتر میں جو جدید انتظام ہوتا ہے اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جشن تاجپوشی میں اس کے نزدیک سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ دفتر میں ایک دن کی چھٹی تھی۔ اور اسی دن کے لیے جنس خرید کر لانا پڑی اور تمام دن غلہ کی منڈی میں تراز و اور بانٹ سے واسطہ پڑا۔ ہندوستان کے سیاسی جمود کا جو کچھ بھی نتیجہ ہو بہر حال وہ تو یہ جانتا ہے کہ اس کے دفتر پر جمود کی کیفیت نہ کبھی طاری تھی نہ آئندہ اس قسم کی کوئی امید ہے۔ جمعیۃ اقوام کا چونکہ اس کے دفتر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اس سے دلچسپی لینا ہی نہیں چاہتا۔ ہندوستان کی قومی زبان اردو رہے یا ہندی اس کے لیے دونوں برابر ہیں۔ اس لیے کہ اس کو تو گھر میں ہندوستانی بولنا ہے اور دفتر میں انگریزی لکھنا۔ فقیراپی کی سرگرمیوں پر وہ اس لیے غور نہیں کرتا کہ جہاں تک اس کا خیال ہے۔ فقیراپی کا کوئی اثر اس کے دفتری معاملات پر نہیں

پڑسکتا۔ مختصر یہ کہ وہ دنیا کے تمام معاملات کو اپنی ناک کی پھنگی پر رکھی ہوئی عینک سے اگر دیکھتا بھی ہے تو اپنے سے غیر متعلق سمجھ کر نہایت مہمل سمجھتا ہے ورنہ عام طور پر وہ اپنے فائلوں ہی کو ختم کرنے اور پچھڑے ہوئے کام کو نپٹانے میں ایسا مصروف رہتا ہے کہ اس کو دنیا کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

دفتر کی مصروفیتوں سے کچھ کم اس کے گھر کی مصروفیتیں نہیں ہوتیں۔ اگر آپ بابو کی گھریلو زندگی دیکھیں تو سب سے پہلے وہ آپ کو کندھے پر رومال ڈالے ہوئے ترکاری منڈی میں نظر آئے گا۔ جہاں اس کی تمام توجہ شلجم اور پرول کی جانب مبذول ہوگی۔ منڈی سے ترکاری لے کر واپس ہوتے ہوئے بنئے کی دوکان اس کا دوسرا اسٹیشن ہوگا۔ اور وہاں سے ایک ہی رومال میں مختلف پوٹلیاں باندھے ہوئے اور ایک ہاتھ میں کٹورا لیے ہوئے جس وقت وہ اپنے گھر کی طرف تیز قدم اٹھائے گا۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں سوائے اس کے اور کوئی فکر نہ ہوگی کہ آٹھ بج چکے ہیں ابھی اسپتال جانا ہے۔ پھر کھانا کھانا ہے اور پھر ٹھیک وقت پر دفتر پہونچنا ہے۔ چنانچہ گھر پہونچتے ہی تمام سودا بوائن کے حوالہ کر کے وہ مختلف چھوٹی بڑی شیشیاں رومال میں باندھے گا۔ نسخے جیب میں رکھے گا۔ اور پھر کسی بچے کی انگلی پکڑے گا۔ اور کسی کو گود میں لے کر اسپتال پہونچ جائے گا۔ اسپتال میں بھی بار بار اس کی نظر گھڑی کی طرف ہوگی اور اسی کی رفتار کے تناسب سے کمپاؤنڈروں کی خوشامد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ لڑکے کی آنکھ میں جلدی سے دوا ڈال دیجیے۔ اور اس لڑکی کا کان دھو دیجیے مجھے دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔ لڑکے کی آنکھ میں دوا ڈلوانے اور لڑکی کا کان دھلوانے کے بعد بوائن کے لیے دوا لینا بھی ضروری ہے ورنہ وہ برا مان جائیں گی کہ میرے کلیجہ کی دھڑکن کا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اسپتال سے دواؤں کے خزانہ سے مالا مال لڑکی کو لادے اور لڑکے کی انگلی پکڑے ہوئے جس وقت بابو

صاحب گھر پہونچیں گے اس وقت دفتر جانے میں مشکل سے چند ہی منٹ باقی ہوں گے۔ جلدی جلدی الٹے سیدھے دس پانچ لقمے مار کر فوراً دفتر کے کپڑے پہنیں گے۔ ایک آدھ کش حقہ کا لیں گے اور بستہ سنبھال کر چھتری بغل میں دبائے اس طرح دفتر کی طرف بھاگیں گے کہ گویا کوئی لاٹھی لیے ہوئے پیچھے آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ راستہ کی تمام چہل پہل ان کے لیے قابل توجہ نہ ہوگی۔ اگر کسی نے سلام کیا تو بغیر دیکھے ہوئے جواب دے دیا اور اگر کسی نے آواز دی تو بہرے بن کر قدم اور تیز کر دیے۔ اب اگر کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ راستہ میں کیا ہو رہا تھا تو آپ اس طرح کورے نکلیں گے کہ گویا اس راستے سے گذرے ہی نہیں ہیں۔

دفتر میں بابو جی کی شان البتہ دیکھنے سے تعلق رکھی ہے۔ کام کی کثرت ہر چند آپ کو پن چکی طرح مصروف کار رکھتی ہے تاہم اگر کوئی اہل معاملہ آ گیا تو آپ اپنے کو اس کے نزدیک لاٹ صاحب سے کم ثابت نہیں کرتے۔ خصوصاً جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس شخص کے کاغذات میرے ہی پاس ہیں اور میں ان کو نہایت آسانی کے ساتھ گڑبڑ میں ڈال سکتا ہوں۔ یا اگر چاہوں تو اسی وقت نکال کر برسوں کا کام منٹوں میں کر سکتا ہوں رشوت لینے کا خیال نہ سہی بلاوجہ پریشان کرنا بھی نہیں چاہتے اگر اہل معاملہ کا کام نکل جائے تو ان کا کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اہمیت جتانا بھی ضروری ہے اور چونکہ اہمیت اسی طرح جتائی جا سکتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات کو نہایت مہتم بالشان بنا کر پیش کیا جائے لہٰذا سامنے رکھے ہوئے کاغذ کو بھی عنقا ثابت کرنے کی کوش کریں گے۔ مثلاً اہل معاملہ نے نہایت خوشامد کے ساتھ کہا:-

''بابو جی آپ چاہیں تو چٹکی بجاتے میرا کاغذ نکلوا سکتے ہیں۔''

بابو جی پہلے تو اپنے کام میں مصروف رہیں گے اور کوئی جواب ہی نہ دیں گے

اس کے بعد جب وہ پھر کہے گا۔ ”بابو جی۔“

”تو آپ صرف کاغذ پر نظر جمائے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہیں گے۔ ہاں ہاں۔ کہہ تو دیا کہ بڑے جھگڑے میں پڑا ہوا ہے وہ کاغذ۔“

اہل معاملہ پھر کھینسیں نکال کر کہے گا۔ بابو جی بڑا نقصان ہو جائے گا۔ آپ ذرا مہربانی کر دیں تو کام نکل جائے۔“

بابو جی چشم غلط انداز سے اس کو دیکھتے ہوئے کہیں گے۔ ”تم دیکھ رہے ہو کہ میں خالی تو بیٹھا ہوا ہوں نہیں کہ بس تمہارا کاغذ ڈھونڈھنے لگوں۔ جب فرصت ہوگی اس وقت پرانے فائل نکال کر تلاش کر دوں گا۔“

اہل معاملہ خوشامدانہ کہے گا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے بابو جی مگر بڑی مہربانی ہوگی۔ میرا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔“

اب بابو جی اس کو جواب دینا پھر ضروری نہ سمجھیں گے اور اپنے کام میں مصروف رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ کٹہرے کے باہر پہلے تو کچھ دیر تپائی پر بیٹھ کر اونگھے گا۔ اس کے بعد الہامی طور پر اس کے ذہن میں آئے گا کہ بابو جی کو پان کھلانا چاہئیں چنانچہ وہ فوراً پان لے کر پھر بابو جی کی خدمت میں حاضر ہوگا کہ ”بابو جی یہ پان لے لو۔“

بابو جی کی نظریں فوراً اس کی طرف اٹھ جائیں گی اور وہ پان لیتے ہوئے کہیں گے۔ ”پان تو ابھی کھا رہا تھا۔ خیر لاؤ۔“

جب اہل معاملہ کے پان بابو جی کے منہ میں پہونچ جائیں گے تو وہ خود ہی اس سے کہیں گے۔ ”اب کی تو ہولی۔ دوالی سب گذر گئیں اور تم ہم کو بھولے ہی رہے۔“

اہم معاملہ تاسف کے ساتھ کہے گا۔ ”کیا کہیں بابو جی کچھ ایسی ہی فکریں تھیں۔ اب بڑے لڑکے کی شادی ہے جتنی چاہیے مٹھائی کھانا۔“

بابو جی کہیں گے۔ ”اب کی کیا کوئی باغ نہیں لیا ہے۔ کیا آموں کی فصل میں بھی سوکھا ہی رہے گا۔“

اہل معاملہ کہے گا۔ ”نہیں بابو جی بھلا یہ کوئی بات ہے۔ تمہارا باغ حاضر ہے چاہے باغ چلو چاہے گھر پر منگا لو آم۔“

بابو جی آموں کا معاملہ پختہ کرنے کے بعد کہیں گے۔ ”پارسال تو خیر اچار ہی مل گیا تھا اب کی تو وہ بھی غائب ہی رہا۔ سیٹھ جی تم روز بروز سیانے ہوتے جاتے ہو۔“

سیٹھ جی اچار کے سلسلہ میں اپنی کوتاہی کا عاجزانہ اعتراف کرنے کے بعد جب اچار بھیجنے کا وعدہ کر لیں گے تو بابو جی نہایت خلوص کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں ان سے پہلے تو کچھ مشورہ کریں گے اس کے بعد اگاہی پر روپیہ لینے کا تذکرہ چھیڑ کر اس بات کی کوشش کریں گے کہ سیٹھ جی خود ہی اس کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اگر سیٹھ جی ہوئے کوئی بدھو اور تیار ہو گئے تو اسی دن ان کا کاغذ ڈھونڈھ دیا گیا اور بابو جی خود ان کے زرخرید غلام نظر آنے لگے اور سیٹھ جی نے ٹال مٹول سے کام لیا تو آموں اور اچار کے وعدہ کے باوجود اور پانوں کے باوصف ان کا کاغذ کھٹائی میں پڑ گیا اور پھر وہ...... اس وقت ملے گا جب سیٹھ جی کے دوڑتے دوڑتے چیتھڑے ہو جائیں۔

بہر حال کچھ بھی ہو بابو کی دفتری زندگی کے وقار اور ان کے بابوانہ اقتدار کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور ایسے ایسے خدا جانے کتنے اہل غرض دفتر میں بابو جی کے حضور ناک رگڑتے اور ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خود بابو جی کو بھی اس دفتر میں بڑے بابو اور چھوٹے صاحب کے سامنے اسی قسم کی باتیں کرنا

پڑتی ہوں۔

دفتر سے واپسی پر بابو جی کا حلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بغل میں بستہ اور چھتری۔ سر پر کسی بے ڈھنگے زاویہ سے رکھی ہوئی ٹوپی ہاتھ میں رومال۔ باچھوں سے بہا ہوا پان اور چہرہ پر دن بھر کی خستگی کے تمام نقوش نمایاں مگر دماغ پر زور دے دے کر یہی سوچتے جاتے ہیں کہ بوائن نے دو پیسہ کے چقندروں اور ایک پیسہ کے پانوں کے علاوہ اور کیا کہا تھا کہ لیتے آنا اس لیے کہ خیال یہ بھی ہے کہ اگر وہ چیز یاد نہ آئی تو گھر پہونچ کر پھر بازار آنا پڑے گا۔ مختصر یہ کہ شام کے قریب بابو جی لدے پھندے گھر پہونچتے ہیں۔ اور گھر پر پہونچ کر پھر گھریلو افکار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ اب کی ہرگز مکاندار کو کرایہ اس وقت تک نہ دوں گا جب تک کہ چھت نہ بنوا دے۔ تمام چھت ٹپکتی ہے اور اگر اس نے واقعی چھت بنوا دی تو کیا کرایہ دینا ہی پڑے گا۔ حالانکہ اگر اس مہینہ کرایہ نہ لیتا تو اچھا تھا اس لیے کہ جوتا بالکل ٹوٹ گیا ہے اور بوائن اپنے بھائی کے لڑکے کے مونڈن میں بھی جانا چاہتی ہے اس کا خرچ الگ ہے۔ لہٰذا ان تمام باتوں پر ایک ناریل پی کر غور کرنا چاہیے۔ اور اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو روٹی کھا کر سو رہنا چاہیے۔

اگر میں ہٹلر ہوتا

اگر میں یہ ہوتا اور اگر میں وہ ہوتا کے سلسلہ کی بہت سی تقریریں میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ نوبت یہاں تک پہونچی تھی کہ اگر میں گھوڑا ہوتا تو کیا کرتا مگر اس سے بھی آگے آج عرض کرنا یہ ہے کہ اگر میں ہٹلر ہوتا تو کیا کرتا۔ بظاہر ایک سیدھا سا سوال ہے اور جواب بھی چنداں مشکل نہیں۔ کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ میں اگر ہٹلر ہوتا تو مجھ کو بھی وہی کرنا پڑتا جو ہٹلر کو کرنا چاہیے۔ مگر ایسی صورت میں جب کہ ہٹلر خود ہی وہ باتیں کر رہے ہیں جو ان کو نہ کرنا چاہئیں یہ سوال یقیناً غور طلب بن جاتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مجھ کو ڈکٹیٹری سے تو انکار نہیں اس لیے کہ میری موجودہ حیثیت سے ڈکٹیٹری بہرحال بلند چیز ہے مگر جب ہٹلر کی ڈکٹیٹری پر غور کرتا ہوں اور اپنے کو ہٹلر فرض کر کے ہٹلر کی موجودہ سرگرمیوں کا نقشہ اپنے پیش نظر لاتا ہوں تو اس سردی میں بھی پسینہ آ جاتا ہے اور اپنی موجودہ کم حیثیتی اس ڈکٹیٹری کے مقابلہ میں بہت غنیمت نظر آتی ہے۔ وہ جو کسی ریڈر میں دیہاتی اور شہری چوہے کی کہانی پڑھی تھی اور جس سے یہ سبق سیکھا تھا کہ ؎

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
وہ ہے خوف وذلت کے حلوے سے بہتر

یہی سبق اور یہی شعر اس موقعہ پر صادق آتا ہے۔ حالانکہ یہاں چوہوں کا

ذکر نہیں ہے۔ گفتگو ہے میری اور ہٹلر کی مگر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعر ہم دونوں کے متعلق نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر غور کیجیے تو ہٹلر اور اس خاکسار میں ہر اعتبار سے تو خیر زمین اور آسمان کا فرق ہے ہی مگر اس بنیادی اصول میں بھی اختلاف ہے۔ ان کا قول ہے کہ “مرو اور اگر نہ مر سکو تو مجبوراً جیو” اور میں قائل ہوں کہ “جیو اور جینے دو” کا میرے یہاں سب سے مقدم زندگی ہے اور اس کے بعد کچھ اور۔ ان کا اصول غالباً یہ ہے کہ جب خود مرنا ہے تو دوسروں کی زندگی کو پرسکون کیوں رہنے دو۔ تو صاحب میں تو نہ اس خودکشی کا قائل ہوں۔ نہ مجھ کو ان معظّمہ سے اتفاق ہے جو خود کبڑی ہو کر دنیا بھر کے لیے کبڑا ہونے کی دعائیں کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ اب قسم کی ڈکٹیٹری اور اس قسم کے ہٹلر بننے سے تو بندہ دور ہی سے سات سلام کرتا ہے۔ البتہ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر ہٹلر خود نہ ہوتا بلکہ اس کی جگہ میں ہٹلر ہوتا تو کیا کرتا۔ اس سوال کا اس رخ سے جواب دینے میں مجھے کوئی عذر نہیں۔

اگر میں ہٹلر ہوتا اور اتنے بڑے ملک کی ڈکٹیٹری مجھے حاصل ہوتی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی خواہ مخواہ کے دردسر سمیٹتا نہ پھرتا۔ برلن کے عالیشان محل میں رہتا جس کے سونے اور کھانے کے کمرے میری توجہ کے خاص مرکز ہوتے اور باہر لان پر بھی خدام دولت ہر وقت منتظر رہتے کہ خدا جانے کس وقت ڈکٹیٹر صاحب ٹینس کھیلنے کے لیے تشریف لے آئیں حالانکہ میں کبھی اپنے کو اس کا پابند نہ بناتا کہ ٹینس کے وقت برج نہ کھیل سکوں۔ اوقات میرے پابند ہوتے نہ کہ ڈکٹیٹر ہو کر اوقات کا میں پابند بنتا۔ آرام کی نیند سوتا اور دلچسپیوں میں دن بسر کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنے فرائض کو خدانخواستہ بھول جاتا اور حکومت کے تمام کام چوپٹ کر کے رکھ دیتا۔ جی نہیں ریشتاغ کے اجلاس میرے زمانے میں بھی ہوتے اور میں بھی اپنے محل سے نکل کر اپنی قوم کا سلام لیتا ہوا جلوس کی شکل میں ریشتاغ کی عمارت تک جاتا۔ مگر وہاں جا کر نوچ کھسوٹ کے مسائل پر غور کرنے کے بجائے اپنے ملک جرمنی کو تمام دنیا کی آنکھوں کا تارا بنانے کی فکر کرتا کہ کس طرح دوسرے ملکوں سے تعلقات خوشگوار بنائے جائیں۔ کیوں کر ہندوستان کو اپنی شرافت کا قائل کیا جائے۔ کس طرح فرانس سے دوستی کے پینگ بڑھائے جائیں اور کون کون سی صورتیں اختیار کی جائیں کہ ساری دنیا کی زبان پر عزت اور محبت کے ساتھ جرمنی کا نام آ جائے۔ اس کے علاوہ خود اپنے اہل ملک کے لیے ہٹلر کی طرح موت کے بہانے نہ ڈھونڈھتا پھرتا بلکہ ان کو زندگی کے حقوق دیکر یہ فکر رکھتا کہ ان حقوق سے وہ خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں یا نہیں۔ یہ نہیں کہ صحتیں خراب ہیں۔ پیٹ کو روٹی نہیں جڑتی مگر ڈکٹیٹر صاحب کو نہ تو صحت کی فکر ہے نہ روزی کی البتہ ادھار کھائے بیٹھے ہیں اس پر کہ ہر وہ شخص جس میں کسی قسم کی زندگی کے ذرا بھی آثار پائے جائیں۔ کندھے پر بندوق رکھے۔ میدان جنگ کی طرف جاتا ہوا نظر آئے۔ ورنہ اس کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ گویا زندہ رہے تو مرنے کو جائے ورنہ اس سے بہتر ہے کہ زندہ ہی نہ رہے۔ کھیتیاں ویران پڑی ہیں اور اسلحہ سازی کے کارخانے دن رات چل رہے ہیں۔ پیٹ میں اناج پہونچے یا نہ پہونچے مگر کارتوسوں میں بارود ضرور بھر جائے۔ زندگی اور صحت کی تدابیر پر غور کرنے والے سائنس دان زہریلی گیس، موت کی شعاع اور اس قسم کی ہلاکت آفریں تدابیر پر غور کریں۔ کام ہے ان کا مرنے والوں کو موت سے بچانا اور سپرد ہے ان کے جینے والوں کو مارنے کا کام تو صاحب اس خاکسار سے تو یہ حرکتیں قیامت تک سرزد نہ ہو سکتیں۔ میں اپنی قوم کو جان بوجھ کر ہلاکت اور بربادی کی طرف یوں کبھی نہ جھونکتا جس طرح ہٹلر صاحب مشقِ ستم فرما رہے ہیں اور اگر، شیطان کے کان بہرے، میرا بھی دماغی، توازن اسی طرح

گڑبڑ ہو جاتا تو میں ڈکٹیٹری چھوڑ کر پہلے اپنا علاج کراتا اس کے بعد ملک اور قوم کے معاملات میں دخل دیتا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ جو کچھ عرض کرنا ہے اس میں موازنہ کی کیفیت پیدا نہ ہو مگر عجب مصیبت یہ ہے کہ ع

بنتی نہیں کسی طرح ہٹلر کہے بغیر

لہٰذا اب یوں کہتا ہوں کہ اپنی جان سے دور اگر میں ہٹلر ہوتا تو اپنے ساتھ اپنی قوم کی زندگی اس بوکھلاہٹ کے ساتھ موت کے سپرد کبھی نہ کرتا بلکہ یقین جانئے کہ زندہ رکھ کر دوسروں کو زندہ رکھتا اور جو کام جرمنی کے یہ خداوند نعمت صاحب توپ کے گولوں سے لے رہے ہیں وہ کام میں اپنے ہمسایوں سے اخلاق اور مروت سے لے لیتا۔ تخفیف اسلحہ کی تحریک اول تو میرے ہی دماغ کا نتیجہ ہوتی ورنہ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ اس تحریک کا سب سے بڑا حامی میں خود ہوتا۔ یہ نہیں کہ تخفیف اسلحہ کے پردہ میں جنگی تیاریاں شروع کر کے دوسروں سے یہ جھوٹ بولتا کہ یہ سب کچھ تو محض اپنے بچاؤ کے لیے ہے اور اس کے بعد جب کیل کانٹے سے اپنے نزدیک درست ہو جاتے تو بے بات کی بات پیدا کر کے میدان میں آ کودتا۔ لاحول ولا قوۃ پھر وہی موازنہ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ حالانکہ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ ہٹلر سے کوئی مطلب نہیں اگر میں خود ہٹلر ہوتا اور جو ہٹلر ہیں وہ ہوتے ہی نہیں تو کیا صورت ہوتی اور میں کس قسم کا ہٹلر ثابت ہوتا۔ اس سلسلہ میں ذرا میرا تفصیلی پروگرام سن لیجیے کہ میرا وقت کیوں کر گزرتا اور میری نقل و حرکت کا مفہوم کیا ہوتا۔ غالباً اس سے میری پالیسی کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے گا۔

برلن کے عظیم الشان محل میں بحیثیت ڈکٹیٹر کے جب صبح میں بیدار ہوتا تو محل میں تعینات فوجی دستہ میری سلامتی کا ترانہ گاتا اور حجام ان چیف روبکارئی خاص چند برقی شعاعوں سے جو ہلاکت آفریں نہیں بلکہ ''شیو آفریں'' ہوتیں شیو بنانے کا اعزاز

حاصل کرتا۔ اس کے بعد ہی آفیسر انچارج حمام خاص احکام غسل حاصل کرنے کے لیے باریاب ہوتا۔ مختصر یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں مجھ عظیم المرتبت شخصیت کو ان ضروریات سے فراغت حاصل ہو جاتی اور میں صبح کے شاہانہ ناشتہ کے ساتھ ہی ذمہ داران حکومت کو شرف باریابی بخشتا تاکہ وہ اپنے اپنے محکمہ کی خیریت سنائیں اور میں ان کو ضروری احکام دے کر رعایا کی فلاح کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مشیران حکومت کو جلد جلد ضروری ہدایات دے کر رخصت کرتا اور اس کے بعد پوسٹ ماسٹر جنرل ڈاک خانہ برلن میرے نام کی ڈاک لے کر حاضر خدمت ہوتا۔ اس ڈاک میں مختلف حکومتوں کے تاجداروں اور ڈکٹیٹروں کے دوستانہ خطوط اور تار وغیرہ ہوتے، خود میری رعایا کی عرض داشتیں ہوتیں۔ کچھ اخباروں کے وی پی ہوتے کچھ سربستہ راز منی آرڈروں کی رسیدیں ہوتیں۔ کسی ڈکٹیٹر کا خط کھولتا تو اس کو اپنی خیریت نہ پہونچنے پر بے قرار پاتا۔ کسی بادشاہ نے اپنی دختر کی شادی کے سلسلہ میں مجھ سے مشورہ طلب کیا ہوتا۔ کسی حکومت کے نمائندہ نے مجھ سے شکایت کی ہوتی کہ دیکھئے صاحب فلاں فلاں حکومت نے ہمارے فلاں فلاں گاؤں میں اپنے مویشی چرنے کے لیے بھیج دئے ہیں اور ہم کو اندیشہ ہے کہ ان مویشیوں کے بعد ان کے چرواہے آئیں گے اور چرواہوں کی تلاش میں ان کے رشتہ دار، نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی طرح ان کی فوج ہماری مملکت میں آ جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہم آپ کو ثالث مقرر کرتے ہیں۔ آپ ان کو سمجھائیے کہ یہ طریقہ اس تہذیب و تمدن کے دور میں صلح و امن کے خلاف ہے۔ اس طرح کے مختلف پیغامات اس ڈاک میں نکلتے اور میں ڈاک دیکھنے کے بعد پوسٹ ماسٹر جنرل کو رخصت کرتا اور ڈاک کے ایک ایک تار اور ایک ایک خط کا جواب خود لکھتا یا اپنے پرائیوٹ سکریٹری سے لکھواتا۔ ہر ایک کو پرخلوص جواب اور آخر میں اشتیاق ملاقات۔ مویشیوں کی مداخلت بیجا کی شکایت کرنے والے ڈکٹیٹر کو

اپنے پاس آنے کا دعوت نامہ یا خود موقعہ پر پہونچنے کی اطلاع دیتا تاکہ دونوں حکومتوں کے ذمہ داروں کو فوراً گلے سے لگا دیا جائے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی صلح جویانہ تدابیر خود بھی اختیار کرتا رہتا اور دوسروں کو بھی ان کی ترغیب دیتا۔ بلکہ اگر خود میری مملکت میں کسی اور ہمسایہ ملک کے مویشی آجاتے اور مجھ کو ان کی آمد کی اطلاع ملتی تو میں ان کے استقبال کا حکم دیتا اور میری ہدایت ہوتی کہ نہ صرف ان کو شوق سے جرمنی کے کھیت چرنے کی اجازت دے دی جائے بلکہ ان کو ان کھیتوں کی طرف ہنکا دیا جائے جن میں ان کے مرغوب ترین چارے کے سامان موجود ہوں۔ اس کے بعد جس ملک کے وہ مویشی ہوتے اس کو شکریہ کا ایک خط بھیجتا کہ آپ کی اس بے تکلفی سے دلی مسرت حاصل ہوئی کہ آپ نے اپنے مویشیوں کے لیے جرمنی کو خانۂ بے تکلف سمجھا۔ آپ کے مویشی ہمارے مہمان ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ میزبانی کے فرائض کچھ دن اور ادا کریں۔ بات تو یہ چھوٹی ہوتی مگر اس کا اثر کتنا پڑتا۔ کیا پھر وہ حکومت کسی وقت بھی میری حکومت سے دشمنی کا ارادہ اپنے ذہن میں لاسکتی۔ میرے خیال میں تو ہرگز نہیں۔ آپ کہیں گے کہ سب کہنے کی باتیں ہیں، جس وقت ضروریات مجبور کرتیں مجھ کو بھی نصیب دشمناں ہٹلر کا رویہ اختیار کرنا پڑتا۔ مثلاً میری حکومت میں خام اشیا کی کمی ہوتی اس وقت زندگی سے بیزار ہو کر آخر میں کیا کرتا۔ یہی نا کہ ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ تو صاحب اس سے مجھ کو کب انکار ہے کہ کوشش نہ کی جائے۔ مگر کوشش کے معنی یہ تو ہیں نہیں کہ جو چیز اپنے پاس نہیں ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے زبردستی شروع کر دی جائے۔ دراصل اس کا آسان طریقہ میری حکومت میں یہ ہوتا کہ فرض کر لیجیے میری حکومت کو پٹرول کی ضرورت ہوتی اور میں دیکھتا کہ رومانیہ کے پاس پٹرول کافی ہے تو میں فرانس سے پٹرول جھپٹنے کے بجائے رومانیہ کو ایک دوستانہ خط لکھتا۔

برادر بجان برابر۔ اپنے ہٹلر کا سلام قبول کرو۔ اب تو خیریت کے دو لفظوں کے لیے ترس گئے۔ خیر صاحب آپ نہ پوچھئے مگر ہم تو ہر وقت دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ بھائی چرچل کے خط سے خیریت معلوم ہو ہی جاتی ہے۔ اس وقت ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید آپ کو جرمنی میں پٹرول کے قحط کی اطلاع اب تک نہ ہوئی ہوگی ورنہ مجھ کو یہ عریضہ لکھنے ہی کی ضرورت نہ ہوتی۔ امید ہے کہ آپ پٹرول مہیا کرنے کے لیے اسی وقت احکامات صادر کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ جرمنی کی تمام مصنوعات آپ کی ہیں اور آپ کو میری ہی قسم جو کسی معاملہ میں کبھی تکلف کریں۔ اور باقی سب خیریت ہے۔ بچے آداب عرض کرتے ہیں۔ سب خورد وکلاں کو حسب مراتب سلام ودعا

بندۂ خلوص، احقر۔ ہٹلر کیوں صاحب کیا اس خط کا اثر نہ ہوتا۔ اور کیا اس قسم کے باہمی تعلقات کے بعد بھی توپ اور بندوق کی ضرورت ہوتی؟ سچ پوچھیے تو اس لڑائی جھگڑے کی ضرورت تو اس لیے پیش آرہی ہے کہ جنگجو ہٹلر صاحب اپنے سوا کسی اور کو دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ قدرت کا ایک مقررہ اصول یہ ہے کہ چیونٹی کی موت اسی وقت آتی ہے جب اس کے پر نکل آتے ہیں۔ اگر وہ محض رینگتی رہے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ اڑنے کی کوشش کرتی ہے اور یہی اس کی موت ہے۔ میں تو زندہ رہنے کے لیے رینگتا ہی رہتا اور مرنے کے لیے اڑنے کی کوشش کبھی نہ کرتا۔ جب صلح میرا اصول ہوتا اور ہر ایک سے دوستی میرا اشعار تو ظاہر ہے کہ بلا وجہ مجھ سے دشمنی کون کرتا۔ اور فرض کر لیجیے کہ اگر اس صلح جوئی اور امن پسندی کے باوجود روس وغیرہ ''آؤ پڑوسن لڑیں'' کی دعوت بھی دیتے تو میرے جان نثار دوست اور میرے غم خوار ہمسائے سب میری مدد کو ہر وقت موجود رہتے۔ اس لیے کہ میں خود ان سب کا غم خوار اور ہمیشہ کام آنے والا دوست ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا

کہ جنگ کے امکانات تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتے اور جنگی گتھیاں سلجھانے والا دماغ رعایا کی فارغ البالی اس کی صحت اور تندرستی کے امکانات کی جستجو میں رہتا۔ خود بھی سکون حاصل رہتا رعایا بھی امن چین سے زندگی بسر کرتی۔ ہمسائے بھی خوش اور دوسری حکومتیں بھی مطمئن۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر میرے ماتحت مثلاً گوئرنگ وغیرہ کہتے بھی کہ سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے گا تو میں ان کو ڈانٹ دیتا کہ گھی نہیں نکلتا تو تیل کھاؤ۔ مگر انگلیاں کیوں ٹیڑھی کرو۔ بات صرف اس قدر ہے کہ خود ہٹلر صاحب ہی مجھ کو یہ سمجھا دیں کہ موت حاصل کرنا خواہ وہ اپنے لیے ہو یا کسی کے لیے کونسا اعجاز ہے۔ وہ جو ایک شعر ہے ؎

کوئی دیکھے ان کی ذردیدہ نگاہی کا فریب
کوئی پوچھے جان لینا کون سا اعجاز ہے

کمال تو ہے زندگی کی راہیں ڈھونڈھنا۔ مرنے اور مارنے کا طریقہ تو ہٹلر صاحب کیا وحشی بھی جانتے تھے اور جنگل کے درندے بھی جانتے ہیں۔

برلن کا اسپتال

(شیشیاں رکھنے، دوائیں انڈیلنے اور مریضوں کے کراہنے کی آوازیں۔ ڈاکٹر صاحب نرس کو آواز دیتے ہیں۔)

ڈاکٹر : ''نرس۔ نرس (گھنٹی بجاتا ہے) بوائے بوائے۔''

بوائے : ''حضور!''

ڈاکٹر : ''دیکھو نرس مس صاحبہ کو سلام بولو۔''

(نرس خود ہی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آتی ہے۔)

نرس : ''گڈ ایوننگ ڈاکٹر۔''

ڈاکٹر : ''گڈ ایوننگ مس۔ نمبر۱۰ کا کیا حال ہے؟''

نرس : ''اوہ۔ اس کو انجکشن سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اب تک یہی بکتا ہے کہ نازی خونخوار ہیں۔''

ڈاکٹر : ''ایک انجکشن اور دیا جائے گا اور نمبر۱۸ اب ٹھیک ہے؟''

نرس : ''اس کو ۳ ڈوز دیئے گئے مگر اس کا دماغ ابھی تک گڑبڑ ہے وہ بولتا ہے کہ جرمن وحشیوں کو مات کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر : ''اور وہ جس مریض کا کل آپریشن ہوا تھا؟''

نرس : ''وہ آج صبح مر گیا اور مرتے مرتے یہی کہتا رہا کہ پاگلوں کی طرح

لڑتے سے اس طرح کا مرنا اچھا ہے۔"

ڈاکٹر : "اس کا مرنا ہی اچھا ہوا۔ اس نے ایک جلسہ میں تقریر کی تھی کہ اگر نازی سپاہی اس جنگ سے باز نہ آئے تو جرمنی یورپ کے نقشہ سے اڑ جائے گا۔ وہ پاگل تھا۔ بالکل پاگل۔ اچھا بوائے نئے مریضوں کو بلاؤ اور نرس دیکھو ہم مریضوں کو دیکھنے کے بعد راؤنڈ کریں گے۔"

نرس : "بہت اچھا"

(نرس جاتی ہے۔)

بوائے : "حضور پولیس ایک مریض کو لائی ہے اور چار پانچ مریض جیل کی لاری پر آئے ہیں۔"

ڈاکٹر : "سب کو ایک ایک کر کے بلاؤ۔ پہلے وہ پولیس والا مریض۔"

بوائے : "ادھر آؤ۔ یہاں کھڑے ہو۔"

(زنجیروں کی آواز اور قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر : "تمہارا نام؟"

مریض : "جان۔"

ڈاکٹر : باپ کا نام؟

مریض : جیک

ڈاکٹر : عمر

مریض : ۲۵ سال

ڈاکٹر : تم کیا بیمار ہو؟

مریض : میں بالکل تندرست ہوں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں میری صحت بالکل اچھی ہے۔

ڈاکٹر : پھر تم کو پولیس نے مریض کیوں کر سمجھا؟

مریض : مرض سمجھتا اگر پولیس کا کام ہے تو چالان کرتا ڈاکٹروں کا کام ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر : اوہو۔ ہم یہ نہیں پوچھتے۔ ہمارے سوال کا جواب دو تم کو مریض کیوں کر سمجھا گیا؟

مریض : یہ سمجھنے والوں سے پوچھا جائے جن کا خیال ہے کہ میرا دل کمزور ہے اور دماغ بھی خراب ہے۔ حالانکہ میں نے صرف فوج میں بھرتی ہونے سے اس لیے انکار کیا تھا کہ میرے نزدیک نازی حق پر نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ وہ صرف امن کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر : تمہارا یہ خیال کب سے ہے؟ یعنی تم کب سے ایسی باتیں سوچنے لگے ہو؟

مریض : جب سے نازی پارٹی نے زبردستیاں شروع کی ہیں۔

ڈاکٹر : ہوں! تمہارے یہاں کسی اور کو بھی یہ مرض ہوا ہے؟

مریض : مرض؟ مرض کیسا۔ یہ مرض ہے کہ میں ایک انصاف کی بات کہہ رہا ہوں؟

ڈاکٹر : یہی مطلب ہے کہ تم کو یہ انصاف کب سے ہو گیا ہے؟

مریض : مجھے ہمیشہ اپنی ذات پر انصاف پسند اور حق گو ہونے کا فخر رہا ہے۔

ڈاکٹر : آئی سی (I See)۔ تم انصاف کے علاوہ حق گوئی میں بھی مبتلا ہو۔ اچھا تم اسپتال میں رہ کر علاج کرو۔ تم کو آرام ہو سکتا ہے مگر سخت پرہیز کرو۔ تمہارا انصاف بھی ٹھیک ہو جائے گا اور حق گوئی بھی جاتا رہے گا۔ بوائے اس کو لے جاؤ۔ اور اس مریض کو لاؤ۔

(زنجیروں کی آواز اور قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر : اس کو کیا ہوا ہے؟

بوائے : حضور اس کی آنکھیں خراب ہیں۔

دوسرا مریض: میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں، میں دیکھ رہا ہو کہ یہ اسپتال ہے یہ گھڑی لگی ہے اس میں آٹھ بج کر تین منٹ آرہے ہیں۔ یہ ڈاکٹر ہیں ان کا یہ چشمہ ہے۔

ڈاکٹر : پھر تمہاری آنکھ میں اور کیا خرابی ہے؟

دوسرا مریض: کوئی خرابی نہیں۔ میری آنکھوں میں اچھی خاصی روشنی ہے مجھے کبھی چشمہ تک کی ضرورت نہیں ہوئی۔ میں فاصلے کی چیزیں بھی دیکھ سکتا ہوں اور نزدیک کی بھی۔ مہین سے مہین چھاپے کی عبارت پڑھ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر : یہ تو سب ٹھیک ہے مگر پھر کیا بات ہے؟

بوائے : حضور رپورٹ یہ ہے کہ اس نے دشمنوں کے فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ یہ صورت سے شریف اور راہ راست پر معلوم ہوتا ہے اور ہمارے کمانڈر کی تصویر دیکھ کر کہا کہ ظلم صورت سے برستا ہے۔

ڈاکٹر : اوہو۔ یہ تو بہت بڑی آنکھوں کی بیماری ہے۔ آنکھوں کی پتلیوں نے غلط چیزیں دیکھنا شروع کر دی ہیں اور یہ اندھے ہوجانے کی علامت ہے۔ تمہاری آنکھیں کبھی دُکھنے آئی تھیں؟

دوسرا مریض: بچپن کے علاوہ کبھی نہیں۔

ڈاکٹر : کسی غیر ملکی کوئلہ کی کان کا کوئلہ ریل وغیرہ میں تمہاری آنکھ کے اندر کبھی پڑا؟

دوسرا مریض: کبھی نہیں اور اگر پڑا ہو تو یاد نہیں۔

ڈاکٹر : تمہارے سر میں کبھی درد ہوتا ہے؟

دوسرا مریض: عام طور پر نہیں۔

ڈاکٹر : اچھا اپنی زبان دکھاؤ۔ اور۔ اور ٹھیک ہے۔ کیا تم نے اپنے افسر کی تصویر دیکھ کر ظالم سمجھا؟

دوسرا مریض: میں اس کو ظالم سمجھتا ہوں۔ وہ قوم کو تباہی کی طرف لے جانے والوں میں سے ایک ہے۔ وہ امن وامان کے دشمنوں کا ساتھی ہے۔ اس کی تصویر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر : اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیل کی رپورٹ غلط ہے۔ تمہاری صرف آنکھیں ہی نہیں دل ودماغ بھی خراب ہے۔ آنکھوں کا تو صرف ایکسس (Axis) بدل گیا ہے مگر دماغ الٹی بات سمجھتا ہے اور دل بھی کمزور ہے۔

(نرس دوڑتی ہوئی آتی ہے)

نرس : وہ مریض جو ابھی پولیس لائی تھی لیٹنے سے انکار کرتا ہے اور وارڈ کے دوسرے مریضوں کو لکچر دے کر اپنے جراثیم پھیلا رہا ہے؟

ڈاکٹر : لکچر دیتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی زبان پر بھی زہر پھیل گیا ہے۔ اس کو آپریشن تھیٹر میں لے چلو میں اس مریض کو دیکھ کر ابھی آتا ہوں۔

دوسرا مریض: کیا اس کی زبان کاٹی جائے گی؟

ڈاکٹر : اس کی جان بچانے کے لیے جسم کے بیکار اور زہریلے حصہ کو کاٹ ڈالنا ہی پڑے گا۔

دوسرا مریض: بے چارے کی زبان۔ اس کی زبان میں کیا خرابی ہے۔

ڈاکٹر : نازی پارٹی کے خلاف لیکچر دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر اور خرابی کیا ہوگی۔ اگر اس کی زبان فوراً نہ کاٹی گئی تو نہ صرف وہ تباہ ہو جائے گا بلکہ اس کی چھوت بہت سے تندرستوں کی صحت خراب کر دے گی۔ اگر کسی مریض کا ہاتھ سڑ جائے تو باقی جسم کو بچانے کے لیے ہاتھ کاٹ ڈالنا چاہیے اسی طرح اس کی زبان کاٹنا پڑے گی۔

دوسرا مریض: تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ ظالمانہ چارہ گری سچ بولنے والوں کو سچائی سے، انصاف پسندی کے حامیوں کو انصاف سے، امن پسندی کے طرفداروں کو امن سے باز رکھے گی۔

ڈاکٹر : یہ سب بہت خطرناک بیماریاں ہیں۔ ہم نے ان بیماریوں کی روک تھام کے لیے نئے نئے آپریشن اور عجیب وغریب انجکشن اور دوائیں ایجاد کر لی ہیں جن کا بہت جلد اور بہت اچھا اثر مریض پر ہوتا ہے۔ سچ بولنے والے بہت سے مریض جھوٹ کے عادی ہو گئے۔ ایک معمولی انجکشن نے بہت سے ایمان داروں کو ایمان داری کا دشمن بنا دیا۔ بہت سے انصاف پسندی کے مریض ہماری دوا کی دو تین خوراکوں کے بعد انصاف کے نام کو بھول گئے اور سب سے بڑا اور عام مرض انسانیت تو ہم نے اینٹی ہیومن ویکسی نیشن یعنی (Anti Human Vaccination) انسانیت کش ٹیکہ سے ایسا کھویا ہے کہ ہماری نازی فوج میں یہ مرض نام کو بھی نہیں۔

دوسرا مریض: کیا مطلب یعنی تم انسانیت کے بھی دشمن ہو۔

ڈاکٹر : تم بہت بھولے ہو۔ جب تک یہ کمزوری ہم میں سے دور نہ ہو اس

وقت تک ہم جنگ جو نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہم نازی بچوں، بڈھوں، جوانوں، مردوں اور عورتوں سب کو صرف چیچک طاعون اور ہیضہ ہی کے ٹیکے نہیں لگاتے بلکہ یہ ٹیکہ بھی لگاتے ہیں، کیا تمہارے یہ ٹیکہ نہیں لگا ہے؟

دوسرا مریض: نہیں۔ میں برلن کا رہنے والا نہیں ہوں دیہات سے یہاں آیا ہوا تھا۔

ڈاکٹر : مگر ہمارے ویکسی نیٹر (Vacciantor) تو دیہاتوں میں بھی گھوم رہے ہیں اور جنگ کے زمانے میں تو اس وبا کو ہم اپنے ملک میں رکھ ہی نہیں سکتے۔ تمہارے سب سے پہلے یہ ٹیکہ لگنا چاہیے۔

دوسرا مریض: (گھبرا کر) نہیں نہیں میں ہرگز اپنی انسانیت سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر : کوئی تکلیف نہ ہوگی تم چپ رہو۔ بوائے فوراً ٹیکہ کا سامان لاؤ۔

دوسرا مریض: نہیں ڈاکٹر صاحب مجھے زہر دے دیجیے۔ مجھے مار ڈالیے میں انسان پیدا ہوا ہوں انسانیت میرا حق ہے میں انسانیت کو کھو کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر : تم میں انسانیت کے بہت سے جراثیم ہیں۔ تم فوراً ٹھیک ہو جاؤ گے گھبراؤ نہیں یہ ویکسی نیشن (Vaccination) تم کو بہت جلد انسانیت سے دور کر دے گا۔ تم انسانیت کا جامہ اتار پھینکو گے۔ یہ بہت عمدہ چیز ہے اس میں شیر اور دوسرے درندوں کا ست ہے اور پاگل کتے جو ہم بڑی مشکل سے مہیا کرتے ہیں ان کا جوہر انجکشن میں موجود ہے۔

دوسرا مریض: میں درندہ بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں پاگل کتوں کی طرح بھونکنا نہیں چاہتا۔ میں انسان ہوں مجھ کو انسان رہنے دو۔

ڈاکٹر : کوئی فکر کی بات نہیں، تمہاری ساری انسانیت رگ رگ سے کھینچ کر چھوٹے سے زخم کی صورت میں بازو پر آجائے گی۔ زخم تھوڑے دنوں میں سوکھ جائے گا اور انسانیت کھرنڈ بن کر جھڑ جائے گی۔ اس کے بعد تم اعلیٰ درجہ کے نازی سپاہی ہو جاؤ گے تم کو وار اسپرٹ مکسچر WAR SPITIT MIXTURE کی دو تین خوراکیں بہت بڑا جنگ جو بنا دیں گی۔

(قدموں کی چاپ)

بوائے : ٹیکہ کا سامان درست ہے۔

دوسرا مریض: مجھے چھوڑ دو یا گولی مار دو میں انسان ہوں، انسان رہنا اور انسان ہی رہ کر مرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر : مت بکو یہ سب انسانیت کا قصور ہے کہ تم جنگ جو بننا اور انسانیت کے خلاف جنگ میں حصہ لینا نہیں چاہتے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم کو بالکل انسان نہ رہنے دیں گے تم پکے نازی بن جاؤ گے۔ صورت شکل آدمیوں کی سی ہوگی مگر درندوں کی طرح پھاڑ کھانے کی اسپرٹ پیدا ہو جائے گی۔ تم سچ، انصاف، ایمانداری، رحم دلی، شرافت اور اسی قسم کی بہت سی چھوٹی چھوٹی بیماریوں سے بچ جاؤ گے۔ چلو ادھر۔"

دوسرا مریض: نہیں ڈاکٹر مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے چھوڑ دو۔

(نرس کے قدموں کی چاپ)

نرس : ڈاکٹر وہ مریض آپریشن تھیٹر میں ہے۔

ڈاکٹر : میرا خیال ہے اس کے بھی ٹیکہ نہیں لگا ہے، پہلے اس پر بھی ٹیکہ کا امتحان کیا جائے۔ اچھا ان کو ٹیکہ لگانے کے بعد دیکھا جائے گا۔

دوسرا مریض: میں یہ ٹیکہ جانور بنا دینے والا نہیں لگوا سکتا۔

ڈاکٹر : نہیں تم جانور نہیں بن سکتے۔ ہمارا ذمہ ہے کہ دُم نہیں نکلے گی چلو بڑھو ادھر۔

دوسرا مریض: (روتی آواز میں) ڈاکٹر صاحب مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں بالکل اچھا ہوں میں ٹیکہ نہیں لگواؤں گا۔

ڈاکٹر : اس کو پکڑ لو بوائے۔ نرس تم ٹیکہ کا سامان سنبھالو۔

دوسرا مریض: (چیخ کر) ارے مار ڈالا۔ میری انسانیت ختم کر دی (زور سے) آہ۔ آہ۔

ڈاکٹر : بس بس۔ بوائے اس کو آرام سے لٹا دو۔ یہ بے ہوش ہو رہا ہے۔

نرس : اور وہ مریض؟

ڈاکٹر : ہاں اب اس کو لاؤ۔ اس کے بھی ٹیکہ لگا دیا جائے۔

(نرس جاتی ہے)

بوائے : اس نے تو آنکھیں بند کر لیں۔

ڈاکٹر : ٹیکہ اثر کر رہا ہے۔ ایک گھنٹہ تک اس کو بے ہوش رہنا چاہیے اس کے بعد ہوش میں آتے ہی اس کو ایک خوراک وار اسپرٹ مکسچر War Spirit Mixture کی دے دی جائے۔

بوائے : کل جو مریض آئے تھے آج وہ سب بالکل ٹھیک ہیں اس مکسچر نے سب کو بہادر نازی بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر : یہ مریض بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور جو مریض ٹھیک ہو گئے ہیں ان کو فوراً اچھاوتی بھجوا دو۔

(قدموں کی چاپ، زنجیروں کی آواز)

نرس : دیکھو خاموش چلے آؤ ہم تم کو بالکل اچھا کرنا چاہتے ہیں تم بہادر ی نازی بن جاؤ گے۔

مریض : خونخوار بنانا چاہتی ہو۔ درندہ بنانا چاہتی ہو جو انصاف، حق و صداقت، امن اور آدمیت کے خلاف جنگ کرے۔

ڈاکٹر : چپ رہو ہم ابھی تمہاری یہ سب تکلیفیں دور کر دیں گے۔ اِدھر آؤ آگے بڑھو۔

مریض : یہ ظلم ہے۔ میری مرضی کے خلاف تم میری فطرت بدل رہے ہو۔ تم جرمنی کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہو۔

ڈاکٹر : چپ رہو۔ شور نہ مچاؤ۔ تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہارے کبھی ٹیکہ لگا ہے؟

مریض : لگا ہے۔ چیچک اور طاعون دونوں کا لگا ہے۔ ہیضہ کا ٹیکہ نہیں لگا۔ اس لیے کہ میں خود ہی فاقے کرتا ہوں۔

ڈاکٹر : نہیں نہیں۔ تم نہیں سمجھے۔ نازی بنانے کا ٹیکہ لگا ہے تمہارے؟

مریض : میں یہ کلنگ کا ٹیکہ کبھی نہ لگنے دوں گا۔ تم نے ساری قوم کا ناس مارا۔ جرمنی کو درندوں کا جنگل بنا کر رکھ دیا اور انھیں درندوں کا شکار کھیلنے کے لیے دنیا کو مجبور کیا ہے۔

ڈاکٹر : نہیں لگا ہے اس کے ٹیکہ اور یہ سب اسی کی خرابی ہے۔ ہمارے ویکسی نیٹر Vaccinator جاتے کیوں سو رہے ہیں۔ ان کو حکم ہے کہ کوئی جرمنی کا باشندہ بغیر ٹیکہ کے نہ رہے۔ بوائے اس کو پکڑ لو۔

مریض : یہ ظلم ہے (بلند آواز سے) زبردستی ہے (اور زیادہ بلند آواز سے) بربریت ہے۔

ڈاکٹر : یہ سب باتیں یہ ٹیکہ پیدا کر دے گا۔ اطمینان رکھو۔ بوائے اس کو آگے بڑھاؤ۔

مریض : ارے میں مر جاؤں گا مار ڈالا۔ مار ڈالا۔ اف۔ آہ۔

ڈاکٹر : بس ٹھیک ہے۔ لٹا دو اس کو آرام سے۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی)

ڈاکٹر : بوائے ٹیلیفون سنو۔

بوائے : (ٹیلیفون رسیور اٹھا کر) برلن ہاسپٹل۔ کہاں سے۔ ریشتاغ اچھا اچھا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔ کون، جنرل وان ڈف، ہاں، ہاں ابھی ابھی، کہتا ہوں۔ او کے (Ok)۔

(رسیور رکھنے کی آواز)

ڈاکٹر : کون تھا؟

بوائے : (گھبرائی ہوئی آواز میں) نازی ملٹری سیکریٹری کے پرائیوٹ سیکریٹری کا فون ہے۔ ریشتاغ میں ایک دم جنرل وان ڈف پر دورہ پڑا ہے سب ان کو سنبھالے بیٹھے ہیں اور وہ بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ صلح کر لینا چاہیے۔ انھوں نے صلح کرنے کے حق میں بہت بڑی تقریر کی ہے۔ آپ کو فوراً وہاں طلب کیا ہے۔

ڈاکٹر : صلح کا دورہ پڑا ہے۔ اچھا ہنڈ بیگ۔ انجکشن کا سامان وار اسپرٹ مکسچر کے تین چار ڈوز فوراً موٹر پر رکھو اور ان مریضوں کو دیکھتے رہو۔

ہوش میں آتے ہی مکسچر دیا جائے گا۔ میں جنرل ڈف کا علاج کر کے ابھی آتا ہوں۔ صلح کا دورہ (بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے) صلح کا دورہ خطرناک بات ہے۔

(قدموں کی چاپ غائب ہو جاتی ہے اور موٹر روانہ ہونے کی آواز آتی ہے۔)

نرس : وارڈ بوائے۔ وارڈ بوائے۔

(شیشیاں اِدھر اُدھر رکھنے اور دوا انڈیلنے کی آواز)

بوائے : (آکر) مس صاحبہ مجھ کو پکارا تھا؟

نرس : دیکھو تم مریضوں کو دیکھتے رہو۔ ہوش آنے ہی والا ہے۔ یہ مسکچر فوراً پلانا ہوگا۔

بوائے : مس صاحبہ وہ دیکھیے آنکھیں کھول رہا ہے۔

نرس : اور یہ مریض بھی منہ چلا رہا ہے۔ (ذرا بلند آواز میں) کیسا ہے تم۔؟

مریض : (پاگلوں کی طرح ہنس کر) مارو۔ مارو (پھر خوفناک ہنسی ہنس کر) مارو۔ مارو۔ مارو۔ (قہقہہ)

نرس : بوائے فوراً مکسچر دو۔ ٹیکہ کامیاب رہا۔ اب اس کا دماغ ٹھیک ہے۔

بوائے : لو اسے پی لو۔ اے جی سنتے ہو اسے پی لو۔

مریض : (پاگلوں کی طرح ہنس کر) تم بھی مارو۔ اڑا دو۔ (ہنسنا)

بوائے : اسے پی لو بہادر نازی۔ جلدی سے پی لو۔

مریض : پی لو۔ پی لو۔ (ہنستا ہے) لاؤ۔ پلاؤ۔ پیو۔ پی لو۔ (ہنستا ہے)

نرس : بہت عمدہ۔ بہت اچھا اثر ہوا ہے بالکل ٹھیک ہو گیا ہے یہ مریض۔ بوائے دیکھو دوسرا مریض انگڑائی لے رہا ہے اس مریض کو ہٹا دو نہیں تو دونوں آپس میں لڑ پڑیں گے۔

بوائے : آؤ جوان ادھر آؤ۔ تمہیں بندوق دیں۔ توپ دکھائیں۔

مریض : (خوفناک ہنسی کے ساتھ) مار ڈالو۔ جو ملے مار ڈالو۔ کوئی نہ بچے (قہقہے فاصلے پر جا کر غائب ہو جاتے ہیں)

دوسرا مریض : (گھبرائی ہوئی آواز میں) توپ، بندوق (روتا ہے) توپ، بندوق (ہنستا ہے) توپ بندوق (قہقہہ)

نرس : لو جلدی سے یہ دوا پی لو۔ بہادر نازی۔ اسے پی جاؤ۔

دوسرا مریض : (قہقہہ بلند کر کے) توپ پلاؤ۔ بندوق۔ بندوق۔ بن اور دوق (قہقہہ)

نرس : اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ بہادر ہو سپاہی ہو۔ لو اسے پی لو۔

دوسرا مریض : آگ لگا دو (قہقہہ بلند کر کے) اجاڑ دو۔ ویران کر دو۔ مارو لوٹو۔ (قہقہہ)

نرس : اوہ بہت عمدہ اثر۔ بالکل تندرست ہو گیا۔ اسے پی لو (کچھ پینے کی آواز) ٹھیک ہے۔

(موٹر رکنے کے آواز)

بوائے : (آتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب آ گئے شاید۔

نرس : (شیشی رکھتے ہوئے) ہاں ڈاکٹر آ گئے۔

(قدموں کے چاپ)

ڈاکٹر : نرس کیا حال ہے مریضوں کا؟

نرس : بالکل ٹھیک ہو گئے۔ بڑا اچھا اثر کیا ہے ٹیکہ نے۔ جنرل وان ڈف کا کیا ہوا؟

ڈاکٹر : ایک دم دماغ سیدھا ہو گیا تھا۔ تقریر کرتے کرتے اس نے نازی

پالیسی کی دھجیاں اڑانا شروع کردیں اور آخر میں تو ایسا بہکا کہ صلح کی اپیل کرنے لگا۔ میں نے جاتے ہی اس کو ریشتاغ سے نکالا۔

نرس : ریشتاغ کو تو ڈس انفکٹ Disinfect کرانا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر : اوہ۔ فوراً میں نے حکم دیا ہے کہ تمام بلڈنگ ڈس انفکٹ کی جائے اور تمام ممبروں کو وارا سپرٹ مکسچر کا ایک ایک ڈوز پینے کی ہدایت کی۔

نرس : تو اب جنرل وان ڈف ٹھیک ہیں نا بالکل؟

ڈاکٹر : ٹھیک کیسے نہ ہوتے ٹیکہ تو ان کے لگ ہی چکا تھا۔ میں نے جاتے ہی ان کو سوفی صدی کا اینٹی پیس Anti Peace انجکشن دیا۔ پہلے تو بہت اچھلے کودے اس کے بعد کھڑے ہو گئے تقریر کرنے اور جو کچھ صلح کی تائید میں کہہ چکے تھے خود ہی اس کی تردید کر دی۔

نرس : سب بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

ڈاکٹر : گوئرنگ نے مجھ کو گود میں اٹھالیا اور باقی تمام ممبروں نے مبارکباد دی۔ میں ان مریضوں کے خیال سے زیادہ ٹھہرا ہی نہیں۔ تو یہ مریض کیسے ہیں؟

نرس : ابھی ہوش میں آئے ہیں میں نے مکسچر پلا دیا ہے اور اب وہ بالکل نازیوں جیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ بلاؤں میں ان کو؟"

ڈاکٹر : ساتھ ساتھ نہیں۔ ایک ایک کر کے۔"

(نرس جاتی ہے)

بوائے : حضور اتنی جلد وہ پلٹے ہیں صحت کی طرف کہ تعجب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر : ان کو اس دوا سے ٹھیک ہونا ہی چاہیے تھا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر یہ دوائیں بے اثر ہوتیں تو آج میدان میں نازی جھنڈے کے نیچے سرفروشی کرنے والا ایک بھی نہ ملتا۔

بوائے : دوائیں کیا ہیں جادو کا اثر رکھتی ہیں۔ بڑے بڑے پرانے اور پیدائشی صلح پسند راست باز۔ ایماندار سچے ایک ہی ٹیکے اور ایک ہی خوراک میں ایسے تندرست ہوئے کہ جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہ تھے۔

(نرس آتی ہے اور اس کے ساتھ وحشیانہ طریقہ پر ہنستا ہوا مریض آتا ہے)

ڈاکٹر : کہو دوست کیا حال ہے۔ لڑائی پر جاؤ گے؟

مریض : ضرور جائیں گے۔ ماریں گے، لوٹیں گے (قہقہہ) توپ، بندوق، مشین گن (قہقہہ)

ڈاکٹر : مگر دیکھو تو یہ بات صلح کے خلاف ہے، صلح کتنی اچھی چیز ہے۔

مریض : صلح۔ ہش۔ صلح فالج کو کہتے ہیں۔ صلح بزدلی ہے۔ ہنگامہ آفت۔ قیامت (قہقہہ) توپ بندوق (مسلسل قہقہہ)

ڈاکٹر : شاباش بہادر، مگر سنو تو سہی یہ لڑائی انسانیت کے خلاف ہے۔

مریض : انسانیت؟ (ہنستا ہے) انسانیت ڈھونگ ہے۔ نازی کو آدمی بنا دینے والی کمزور چیز، لڑائی کی دشمن، ہم لڑیں گے، قیامت مچا دیں گے۔

ڈاکٹر : یہ تو ٹھیک ہے بہادر سپاہی مگر ایمانداری؟

مریض : (بہت زور سے ہنس کر) ایمانداری؟ ایمانداری کو توپ سے اڑا دیں گے۔ ہم نازی ہیں ایمانداری سے لڑینگے۔ ایمانداری کا پیچھا کریں گے (قہقہہ)

ڈاکٹر : بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا دیکھو نرس اس کے کان بہرے کر دو تا کہ یہ جنگ کے ہنگاموں کی آواز کے علاوہ اپنی ہی کہے کسی اور کی نہ سنے۔ یاد رکھو سب سے پہلا نازی اصول یہی ہے کہ بارہ ہاتھ کی زبان ہو۔

اور کان ندارد۔

نرس : میں اسے بہرا کیے دیتی ہوں عقل کے دروازے بند ہی ہو چکے ہیں اور اب یہ پورا نازی بن گیا ہے۔

ڈاکٹر : ہاں اسے بہرا کر کے چھاؤنی بھیج دو اور دوسرے مریض کو لاؤ۔

بوائے : لایئے مس صاحب میں اس کو بہرا کرنے کے کمرے میں پہونچا دوں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی)

ڈاکٹر : (رسیور اٹھا کر) ہاؤس سرجن برلن ہاسپٹل۔ اچھا اچھا ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ بہت اچھا کیا (نرس آتی ہے) اور بہت اچھا انتظام ہے۔ بیشک ہم سب نے غلط سمجھا تھا۔ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ بائی بائی

نرس : کون تھا؟

ڈاکٹر : سپرنٹنڈنٹ پاگل خانہ۔ اس نے کہا کہ ہم لوگوں نے مدتوں سے یہ غلطی کی تھی کہ بہت سے پاگل جیل خانے میں بھر رکھے ہیں اور کارآمد نازیوں کو خواہ مخواہ پاگل خانہ میں بھر رکھا ہے مگر اب ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ان سب کو فوج میں ہونا چاہیے اور جیل والے قیدیوں کو اصل میں پاگل خانے میں جانا چاہیے۔

نرس : ڈاکٹر آخر اس بات پر آج تک کسی نے غور کیوں نہیں کیا تھا۔ وہ تو سچ مچ بنے بنائے سپاہی ہیں۔

ڈاکٹر : اور جیل والے بنے بنائے پاگل۔"

نرس : بالکل! اچھا تو اب اس غلطی کو ٹھیک کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر : ہاں۔ سارا پاگل خانہ خالی کر کے فرنٹ پر بھیج دیا گیا ہے اور جیل کو پاگل خانہ بنا دیا گیا ہے۔

نرس : ٹھیک ہے اچھا اب اس مریض کو دیکھو یہ چپ بہت رہتا ہے۔

ڈاکٹر : یہ تو وہی ہے نا جس کو آج ہی اس پہلے مریض کے ساتھ انجکشن دیا گیا ہے۔

نرس : ہاں ہاں وہی تو ہے۔

ڈاکٹر : کیوں تم کیسے ہو کیا حال ہے تمہارا؟

دوسرا مریض : میں خالی بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔ کس کا منھ نوچوں کس سے لڑوں (وحشیانہ طریقہ پر) کس کو گولی کا نشانہ بناؤں کس کو پھاڑ کھاؤں۔

ڈاکٹر : بُری بات۔ بہت بُری بات۔ یہ سب انسانیت کے خلاف باتیں ہیں۔

دوسرا مریض : انسانیت؟ انسانیت کیسی؟ (قہقہہ لگا کر) انسانیت کیا ہوتی ہے؟ ہم نازی ہیں۔ ارے ہم نازی ہیں۔ انسانیت کو ہم کیا کریں گے۔

ڈاکٹر : تم لڑنا چاہتے ہو مگر یہ تو بہت بری بات ہے کہ حق کے خلاف لڑو۔

دوسرا مریض : حق۔ ہمارا حق صرف لڑنا ہے۔ اُدھم مچانا ہمارا حق ہے۔ ہم صرف شرپسند ہیں۔ ہنگامہ ہمارا حق ہے۔ جنگ ہمارا حق ہے اور باقی حق کچھ نہیں۔

نرس : دیکھ رہے ہو ڈاکٹر کتنا حیرت انگیز طریقہ پر اثر ہوا ہے۔

ڈاکٹر : اس کو بھی بہرا کر کے چھاؤنی روانہ کر دو۔

مریض نمبر۲ : ہو (قہقہہ بلند کرتے ہوئے) چھاؤنی۔؟ چھاؤنی نہیں توپ۔ توپ کا گولہ۔ بم کا گولہ۔ (مسلسل قہقہے)

(آوازیں بتدریج غائب ہو جاتی ہیں۔)

میں جاتا ہوں

(معنون کرتا ہوں میں اپنے اس مضمون کو اُن سور ماؤں کے نام سے جو ہٹلر سے نہیں بلکہ اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں اور لڑائی پہ نہ جانے کا صرف یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ وہ کسی طرح نہیں مانتیں، حالانکہ ان کو منانے کی ترکیب کچھ اور ہی ہے۔)

گھر میں ایک کہرام تھا، بچے اجاڑ پھر رہے تھے، ملازم سہمے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔ چولھا ٹھنڈا پڑا تھا، بلی بھوک کے مارے سب کے پیروں میں لپٹتی پھرتی تھی اور ہر ایک اس کو جھڑک دیتا تھا۔ بیگم لحاف کے اندر گھسی ہوئی رو رہی تھیں اور ہم آرام کرسی پر لیٹے ہوئے سیٹی بجا رہے تھے کہ یکا یک ڈیوڑھی سے آواز آئی۔ ''سواری اتروالو'' بیگم نے لحاف کے اندر سے اپنا تمتمایا ہوا چہرہ نکالا۔ نوکر ڈیوڑھی کی طرف دوڑے، بچے کچھ ٹھٹک گئے، بلی نے کہا ''میاؤں'' اور ہم نے اپنے دل میں کہا الٰہی خیر۔

دیکھتے کیا ہیں کہ خوش دامن صاحبہ پانچے سنبھالتی گھر بھر کو گھورتی مسولینی کی طرح پھنکاریں مارتی تشریف لا رہی ہیں۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ ماجرا کیا ہے۔ کرسی سے اٹھ کر فرشی سلام کیا اور خشمگیں آنکھوں سے خشک قسم کا جواب پایا۔ گویا کہا تو گیا ''جیتے رہو'' مگر معنی اس کے یہ ہوئے کہ ''خدا غارت کرے تم کو''۔ خوش دامن صاحبہ ایک جنگی ٹینک کی طرح صحن کے نشیب و فراز طے کرتی ہوئی اپنی صاحبزادی کے بستر کے پاس پہونچیں اور سرہانے بیٹھ کر پہلے تو اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو درست فرمایا اس کے بعد ہم کو آواز دے کر اس طرح طلب کیا گیا کہ گویا کوئی فوجی مجرم کورٹ مارشل کے لیے بلایا گیا ہو۔ مگر ہم ٹھہرے ہونے والے سپاہی جس کو کچھ ہی باتوں کے بعد میدان میں جا کر اس سے کہیں زیادہ خوفناک مناظر سے دوچار ہونا تھا لہٰذا فوجی جرأت کے ساتھ آرام کرسی سے اٹھے اور خوش دامن صاحبہ سے جا کر عرض کیا ''فرمایئے۔''

خوش دامن صاحبہ نے گوریّنگ کی طرح نتھنے پھلا کر کہا۔ ''یہ آخر تم نے کیا آفت مچا رکھی ہے؟ اگر بھیا تم کو اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے تو کم سے کم ان معصوم بچوں کی طرف دیکھو آخر بیوی بچوں کا بھی کوئی حق ہے۔''

وہ پوچھ بیٹھیں بیوی بچوں کے حق کے متعلق اور ہم سوچ رہے تھے ساس کے حقوق کے متعلق، بہر حال ہم نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا۔ ''مجھے اپنی جان بھی عزیز ہے اور بیوی بچوں کی حق تلفی کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

خوش دامن صاحبہ نے ٹیپ کا بند ارشاد فرمایا۔ ''پھر یہ آخر لڑائی پر جانے کی کیا سوجھی ہے؟''

ہم نے ایک بہادر سپاہی کی طرح اس خطرناک سوال کا جواب دیا۔ ''اس لیے جانے کا ارادہ ہے کہ موت صرف ایک مرتبہ آتی ہے اور صرف میدان جنگ ہی میں نہیں بلکہ گھر کا پتہ بھی اس کو معلوم ہے اور اگر اس کو آنا ہے تو وہ یہاں تک آ سکتی ہے۔''

خوش دامن صاحبہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آج تک کبھی لاجواب نہیں ہوئیں چنانچہ اس موقعہ پر بھی بولیں۔ ''یہ تو ٹھیک ہے کہ موت برحق ہے اور جو پیدا ہوا ہے اس کو ایک دن مرنا ضرور ہے مگر یہ تو جان بوجھ کر موت کے منھ میں

جانا ہوا۔"

ہم نے کہا۔ "یہ آپ کیوں کر کہہ سکتی ہیں؟ آخر آپ لوگ اس بات کو اس رُخ سے کیوں دیکھتے ہیں؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ لڑائی پر جانے کے معنی یہ ہیں کہ موت کو گویا اپنے سے دور بھگایا جائے اور زندگی کو موت کے بھیانک درندوں کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔"

خوش دامن صاحبہ کی تعلیم ذرا واجبی سی ہے۔ لہٰذا وہ فوراً بولیں۔ "کیا مطلب ہے؟"

ہم نے مطلب سمجھاتے ہوئے یہ سمجھ کر کہ یہ کچھ بھی نہ سمجھی ہوں گی اور براہ راست اپنی بیٹی کی ماں ثابت ہوں گی۔ بہر حال کہنا شروع کیا۔

"یہ لڑائی دراصل موت اور زندگی کی لڑائی ہے۔ میں جس طرف سے لڑنے جا رہا ہوں وہ طاقت زندگی حاصل کرنے اور زندہ رہنے کے حق کے لیے اس طاقت سے لڑ رہی ہے جو سوائے اپنے کسی اور کو زندہ دیکھنا ہی نہیں چاہتی۔ اگر جیت ہماری ہوئی تو ہم سب کی زندگی محفوظ اور بے خطر ہوگی ورنہ ہماری زندگی پر موت کی حکومت ہوگی۔"

بیگم صاحبہ نے اپنا دہکتا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر اپنی والدہ صاحبہ کی سرحد سے ہم پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیوی بچوں کا خیال تو اسے ہوتا ہے جو بیوی بچوں کو کسی شمار قطار میں بھی سمجھے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسی بیوی بچوں کے جنجال سے اپنی جان چھڑانے کی یہ ترکیب نکالی ہے۔ مگر میں بھی کہے دیتی ہوں کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر میں تو ہرگز جانے نہ دوں گی۔"

ہم نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے کو ہٹلر اور مسولینی سے بھی بڑا خطرہ سمجھتی ہیں کہ گویا میں آپ سے بچنے کے لیے ان دونوں کے مقابلہ کو آسان سمجھتا

ہوں۔ مگر ہاں اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ ان دونوں پر فتح پالینا آسان ہے مگر آپ......" بیگم نے بات کاٹ کر کہا۔ "آخر صاف صاف کیوں نہیں کہتے ہو کہ یہ سب کچھ کیوں کیا ہے اور یہ ارادہ کس وجہ سے ہوا ہے؟"

خوش دامن صاحبہ نے پھر اپنا رُخ بمشکل تمام یعنی بڑے اہتمام کے ساتھ ہماری طرف کرتے ہوئے فرمایا۔ "وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ آخر بات کیا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "ان کو تو ہے وہم۔ نہ میں نے کسی خاص سبب کی وجہ سے یہ ارادہ کیا ہے نہ اس ارادہ کی کوئی اور وجہ سوائے اس کے ہو سکتی ہے کہ یہ ایک فرض ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "خیر بس اب رہنے بھی دو۔ نہ پہلے کبھی اس فرض کا خیال آیا نہ کچھ۔ اس دن جب میں نے وہ موئے پتے کھیلنے کو منع کیا ہے اور ذرا سی بات کہہ کر ایک قیامت تم سے اٹھوائی ہے بس جب ہی سے یہ رٹ لگی ہوئی ہے۔"

خوش دامن صاحبہ نے پان کا تبادلہ ایک گال سے دوسرے گال کے ضلع میں کرتے ہوئے فرمایا۔ "پتے کیسے؟ کیا اب یہ شوق بھی ہوا ہے"

بیگم نے گویا آخری ترپ چلتے ہوئے کہا۔ "ایسا ویسا شوق! دن رات موئے پتے ہونے لگے ہیں، آدھی آدھی رات تک دوستوں کا مجمع ہے اور بازی پر بازی ہو رہی ہے۔ میں نے آخر اُس دن اتنی بات ضرور کہی کہ یہ موا منحوس کھیل ہے جس گھر میں ایسے کھیل ہوں وہاں کبھی برکت نہیں ہو سکتی، پھر یہ کہ ایک تو اتنی سی تنخواہ میں یونہی خرچ چلنا دشوار ہے۔ دوسرے جب روپیہ لگا لگا کر تاش ہوں گے تو گھر کا خدا ہی حافظ ہے بس یہ کہنا تھا کہ جیسے کسی نے بارود میں آگ لگا دی، بھڑ کے چھتے کو چھیڑ دیا، سارا گھر انھوں نے سر پر اٹھا لیا یہ چیز توڑ وہ پھوڑ، کیتلی موئی ٹوٹی آئینہ چور چور ہو گیا اور۔"

ہم نے عاجز آ کر کہا۔ "ارے صاحب اسی وجہ سے تو منہ کالا کر رہا ہوں کہ

آپ کو میرے غصے، میرے جوئے اور میرے منحوس اشغال سے نجات مل جائے گی۔ اب آخر یہ دُکھڑا کیوں رویا جا رہا ہے۔’’

خوش دامن صاحبہ نے اگال دان سے مشورہ کرنے کے بعد کہا۔ ‘‘بھیا اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں تمہارا گھر ہے اور تمہاری کمائی چاہے اسے رکھو یا اُڑاؤ تمہیں اختیار ہے مگر ہاں اتنا میں بھی کہوں گی کہ اس موئے شوق کے پیچھے لاکھ کے گھر خاک ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔ اللہ بخشے تمہارے خسر کو گھوڑ دوڑ کا شوق تھا۔ ہزاروں روپیہ اس موئے شوق کے پیچھے پھونک دیا، مگر جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو ایسی توبہ کی کہ پھر کبھی گھوڑ دوڑ کا نام تک نہیں لیا۔’’

ہم نے کہا۔ ‘‘ارے صاحب، کبھی کبھی کا دل بہلاوا ہے۔ آج کل کون ایسا ہے جو برج نہ کھیلتا ہو، مہذب لوگوں کا خاص مشغلہ یہی ہے۔ میں تو خیر گھر ہی میں بیٹھ کر کھیل لیا کرتا ہوں ورنہ اور لوگ تو کلب میں جا کر کھیلتے ہیں اور ان کو کوئی بھی نہ جواری کہتا ہے نہ کوئی اس طرح ٹوکتا ہے۔ گھر سے رات بھر غائب رہتا یا دوسرے لوگوں کی طرح اس شوق کے بجائے کوئی اور شوق شروع کر دیتا تو پتہ چلتا ان بیگم صاحبہ کو کہ شوق کسے کہتے ہیں۔ مگر نہ مجھے دنیا کا کوئی شوق نہ میں کسی بُری بات میں۔ لے دے کر تاش کبھی کبھی کھیل لیتا ہوں تو تمام دنیا میں اس کا رونا رویا جاتا ہے۔ بہر حال اب یہ سب قصے ہی پاک ہوئے جاتے ہیں۔’’

خوش دامن صاحبہ نے اپنے تمام اختیارات سے کام لے کر کہا۔ ‘‘ہوش میں آلڑکے۔ قصہ پاک ہوا جاتا ہے۔ جاؤ تو سہی لڑائی پر پھر دیکھو۔ یہ نہ سمجھ لینا گھر سے نکلنا ایسا آسان کام ہے۔’’

ہم نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ‘‘اب تو بہر حال طے ہی ہو چکا ہے۔ آج ۸/ تاریخ ہے، ۲۰/ کو بمبئی سے جہاز روانہ ہوگا اس پر روانگی کا حکم مل چکا ہے۔’’

بیگم نے کہا۔ ‘‘سب کچھ طے ہو چکا ہے مارے غصے کے فوراً اپنے کو بھرتی کرا دیا۔ اس کے بعد ہی روانگی کا حکم بھی جا کر لے آئے۔’’

خوش دامن صاحبہ نے ماتھے پر ‘‘ہائے کمبخت’’ والا ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ ‘‘واہ واہ جس کا ایسا کچا ساتھ ہو کہ چھوٹے چھوٹے بچے جن کو ابھی ذرا بھی سمجھ نہیں، گھر میں کوئی دوسرا نہیں جو گھر سنبھال سکے نہ کوئی موئی ایسی جائداد رکھی ہے کہ سب کا پورا پڑ جائے وہ نا سمجھی میں ایسی حرکت کر بیٹھے۔ اور آخر تھی یہ تمہاری بھی تو زیادتی تھی کہ مرد کو بات بات پر تم نے ٹوکا۔ اے تاش کھیلتے تھے تو تمہاری بلا سے، مرد نہ معلوم کیا کیا کرتے پھرتے ہیں۔ تمہارے باوا کو تو اگر میں آدھی بات بھی گھوڑ دوڑ کے لیے کہہ دیتی تو قیامت برپا کر دیتے۔ ایسی باتیں عورتوں کے سمجھانے سے تھوڑی سمجھ میں آیا کرتی ہیں جب سمجھیں گے خود ہی سمجھیں گے۔

ہم نے حالات امید افزا دیکھ کر کہا۔ ‘‘میں خود کب یہ کہتا ہوں کہ تاش کھیلنا اچھی چیز ہے مگر دل بہلانے اور دن بھر کی دفتر کی چکی کے بعد دماغ تازہ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ آخر ہونا ہی چاہیے۔ اگر کبھی ایک آدھ روپیہ لگا کر تاش کھیل لیے تو کون سا ہرج ہو گیا۔ ہزاروں کمانے والا اگر دس پانچ اڑا بھی دے تو آخر اس میں اس قدر برہمی کی کون سی بات ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا منہ پھلائے لیٹی ہوئی ہیں، بات کا جواب ندارد۔ سبحان اللہ گویا ہم آدمی تو ہیں نہیں جانور ہیں یا شاید یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کے زر خرید ہیں عجیب طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔’’

خوش دامن صاحبہ نے موقعہ کی نزاکت اور بیٹی کے سہاگ کو مد نظر رکھ کر فرمایا۔ ‘‘نہیں تم ٹھیک کہتے ہو یہ ان کی غلطی ہے۔ مگر بیٹا تم اس حکم کو کسی طرح ٹالو۔ ان کی نا سمجھی کی وجہ سے اتنی بڑی نا سمجھی تم کیوں کر رہے ہو؟’’

ہم نے کہا۔ ''نا سمجھی تو خیر میں نہیں کر رہا ہوں۔ خدا اس موقعہ پر سب کو لڑائی پر جانے کی توفیق دے۔ بہر حال کوشش کروں گا کہ یہ حکم ٹل جائے۔''

اس معرکہ کے بعد سے گھر میں امن ہے۔ بھرتی تو خیر پہلے بھی نہ ہوئی تھی اور نہ ہمارے ایسے کمزور دل لڑائی کا تصور کر سکتے ہیں مگر وہ جو مثل ہے نا ''بوڑھا ڈرائے مرنے سے جوان ڈرائے نکلنے سے۔'' چنانچہ آموں کے پارسل کی بلٹی کو لڑائی پر جانے کا حکم کہہ کر سب کو دھمکا دیا اور اب نہ لڑائی ہے نہ کچھ۔ باہر مردانہ میں ٹھاٹھ سے تاش ہوتے ہیں اور اندر سے بیگم ہنسی خوشی اپنے جواری شوہر اور اس کے قمار باز دوستوں کو پان بنا بنا کر بھیجتی رہتی ہیں۔ بغیر لڑائی پر گئے ہوئے ہماری تو گویا یہی فتح ہے۔''

بوہنی میں السیٹ

آپ کا ایسا ہی برا بھلا کہنے کو جی چاہتا ہے تو آپ زیادہ سے زیادہ مجھ کو شاعر کہہ سکتے ہیں مگر مشاعرہ میں ہرگز نہیں ہوں۔ اور اگر آپ انصاف سے کام لیں تو یہ واقعی زیادتی ہے کہ ایک فرد واحد کو پورا مشاعرہ سمجھ لیا جائے۔ مگر مجھ بدنصیب پر یہ زیادتی ہو چکی ہے جس کی داستان ذرا تفصیل طلب ہے۔

جھوٹ کیوں کہوں شاعر تو خیر میں ہوں۔ بھئی شاعر ہونا اسی کو کہتے ہیں نا کہ انسان کا ایک تخلص ہو، وہ شعر کہتا ہو، کہہ کر پڑھتا ہو اور اگر زیادہ شامت آ جائے تو چھپواتا بھی ہو۔ مجھ کو اپنی تمام کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ تخلص بھی ہے نظمیں اور غزلیں بھی کہتا ہوں مشاعروں میں شرکت بھی کرتا ہوں اور اپنا کلام رسالوں اور اخباروں میں چھپواتا بھی ہوں مگر اس کے باوجود مجھ کو زیادہ سے زیادہ آپ شاعر ہی تو کہہ سکتے ہیں میں مشاعرہ کیوں کر ہو سکتا ہوں، مگر قسمت میں یہ بھی لکھا تھا، میں صرف شاعر نہیں بلکہ مشاعرہ بن کر رہوں چنانچہ قسمت کے لکھے کو میں نہ مٹا سکا۔

جرم صرف یہ ہوا کہ اپنے چند معاصرین کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک مشاعرے کے دعوت نامے کے جواب میں لکھ دیا کہ مجھ کو شرکت میں کوئی عذر نہیں مگر میں مشاعرہ کمیٹی سے اتنی رقم وصول کروں گا۔ ظاہر ہے کہ یا تو آدمی اس قسم کی ادبی محافل میں شرکت کی کوئی فیس ہی نہ لے اور اگر لینا ہی ہے تو پھر اپنے شایان شان

لے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ عام آدمی عموماً اور شاعر خصوصاً اپنی قیمت کا کچھ زیادہ ہی تخمینہ لگاتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ مشاعرہ کمیٹی نے میرے مطالبہ کو بظاہر اپنی حیثیت اور دراصل میری اوقات سے زیادہ سمجھ کر مجھ کو لکھا کہ یہ بہت زیادہ ہے اس میں تخفیف فرمائی جائے۔ اس قسم کے موقعوں پر خود دار آدمی عجیب کشمکش میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ اگر مول تول کرے تو شاعری اور ترکاری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور اگر راضی برضا ہوجائے تو معاوضہ وہ ملتا ہے جس کی رسید دینے سے تو مرجانا ہی بہتر ہے۔ اور اس صورت میں اب اپنے مطالبے سے نیچے اترنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا خواہ مشاعرے کی شرکت سے محروم ہی کیوں نہ رہنا پڑتا۔ لہٰذا جواب میں ذرا سختی سے لکھ دیا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ شاعر سے دام چکا رہے ہیں۔ اس ''فرش نشین'' مگر عرش نشیمن'' کو نیلام پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ اگر مطلوبہ رقم پیش کرنے سے آپ قاصر ہیں تو یہ خاکسار بھی شرکت مشاعرہ سے معذور ہے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ تو مشاعرے کو ذریعۂ معاش بنانے کا ارادہ کیا اور اس میں بھی مول تول شروع ہوگیا۔ سبحان اللہ! اس کو کہتے ہیں ''بونی میں السیٹ'' خیر۔ وہ کچھ بھی ہو مگر یہ تو نہیں ہوسکتا کہ نیلامی بولیاں کوئی اپنے اوپر شروع کرادے۔ شرکت مشاعرہ سے انکار کرکے مشاعرے کی طرف سے ایک آدھ دن میں صبر آہی گیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ صبر آخر آہی جاتا ہے اور وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ مگر اس سے زیادہ سچی بات کسی نے یہ کہی ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، یعنی قطعی غیر متوقع طور پر اس مشاعرے کے سکریٹری صاحب کا پھر ایک گرامی نامہ موصول ہوا کہ ''مشاعرہ کمیٹی نے آپ کے والا نامہ پر غور کرنے کے لیے ایک خصوصی اجلاس طلب کیا اور گرما گرم مباحثہ کے بعد آخر کار طے یہ ہوا کہ آپ کا مطالبہ منظور کرلیا جائے۔ چنانچہ گذارش یہ ہے کہ اب آپ مقررہ تاریخ پر پہونچنے کے لیے صبح کی ٹرین سے روانہ ہوجائیں تاکہ شام کو یہاں پہنچ سکیں اور آپ کا استقبال آپ کے شایانِ شان ہوسکے۔''

کیوں صاحب ان حالات میں اگر یہ خط آپ کے پاس آتا تو کیا آپ کو اپنی اہمیت کا احساس نہ ہوتا اور کیا آپ غور نہ کرتے کہ صرف آپ کے ایک خط پر غور کرنے کے لیے ایک عظیم الشان مشاعرے کی مشاعرہ کمیٹی کا اجلاس خصوصی طلب کیا گیا اور اس میں گرما گرم مباحثہ ہوا اور فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوا۔ پھر یہ کہ آپ کے شایانِ شان استقبال تک کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ آپ یقیناً اس خط کو بار بار پڑھتے جیسا کہ میں نے پڑھا اور ایک ایک لفظ کے معنی نکالتے جس طرح میں نے نکالے اور آخر اس استقبال کے شایانِ شان اپنے کو بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کہ سیاہ شیروانی تو ہونا ہی چاہیے اس لیے کہ ایک تو یہ شام کا لباس ہے۔ دوسرے سیاہ شیروانی پر سفید ہار کے سفید پھول خوب کھلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ٹرین سے اترتے ہی مشاعرہ کمیٹی کے لوگ استقبال کی ابتداء ہار پہنا کر کریں گے اور فوٹو گرافر مختلف زاویوں سے تصویریں بھی لیں گے۔ ان تصاویر میں سیاہ شیروانی اور اس پر ہاروں کے سفید پھول پھوٹ نکلیں گے۔ پھر شیروانی تو تصویر کو سجا دیتی ہے بشرطیکہ چوڑی دار پاجامہ کسی موچی نے نہیں بلکہ کسی باقاعدہ درزی نے سیا ہو۔ شیروانی بغیر چوڑی دار پاجامہ کے سہاگن نہیں معلوم ہوتی اور چوڑی دار پاجامہ بغیر پھول دار موزوں اور وارنش کے پمپ کے کچھ بندوق کا غلاف بن کر رہ جاتا ہے۔ لطف آجائے اگر اس لباس پر ایک اعلیٰ درجہ کی جناح کیپ بھی ہو۔ اس تمام سامان کا تخمینہ ذرا حوصلہ شکن ضرور تھا مگر مشاعرہ کمیٹی سے جو رقم طے ہوئی تھی اس میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں۔ چنانچہ یہ تمام سامان خریدنے میں پوری ریاست سے کام لیا گیا اور درزی کو ہدایت کر دی کہ اجرت کا کوئی سوال نہیں البتہ شیروانی ایسی ہو کہ مشاعرہ لوٹ

لائے اور چوڑی دار پاجامہ بھی ایسا ہو کہ حاصل مشاعرہ سمجھا جائے۔ کرتا آپ کی دعا سے موجود تھا جو اسی قسم کی تقریبات کے لیے تبرک کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ اس کرتے پر جو بیل کڑھی ہوئی ہے اس کے پھولوں کو اکثر دھوکہ کھا کر سونگھ لیا کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں اسی کرتے کی سب سے زیادہ فکر تھی اور شکر ہے کہ یہ کُرتہ مع اپنے گریبان کے اگست ۱۹۴۷ء کے دست وحشت سے صاف بچ گیا۔ اس کرتے کے نیچے جالی دار بنیان کچھ ایسا منظر پیش کرتی ہے گویا جمنا کے اندر تاج محل کا عکس پڑ رہا ہو۔ مگر معاف کیجیے گا یہ ایک غیر ملکی قسم کا استعارہ ہے۔ استعارہ بھی نہیں بلکہ غیر ملکی تشبیہ ہے تو اب اس کو یوں سمجھئے کہ اس کرتے کے نیچے جالی دار بنیان ایسی معلوم ہوتی ہے گویا سمندر میں کلفٹن جھانک رہا ہو۔ مگر ان چیزوں کے علاوہ سفر کے لیے اور ایسے سفر کے لیے جس کا اختتام عظیم الشان استقبال پر ہونے والا ہو۔ بے شمار چیزوں کی ضرورت تھی۔ مثلاً ایک اعلیٰ درجہ کا سوٹ کیس ہونا چاہیے تھا۔ خیر وہ تو بیگم صاحبہ نے کہا کہ میں اپنے بھائی جان سے منگا دونگی۔ بستر کے لیے ہولڈال تو خیر موجود تھا مگر اس کے تسمے گھوڑے تانگے کا کھیل کھیلتے ہوئے بچے اپنے صرف میں لا چکے تھے لہٰذا وہ بھی خریدے گئے۔ اب رہ گیا بستر کا سامان۔ اس سلسلہ میں آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ آپ کا یہ غلام بے حد خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ بستر کی سب سے بڑی چیز ہے۔ لحاف۔ وہ بیگم صاحبہ کے جہیز میں آیا تھا اور اگر انکسار سے کام نہ لیا جائے تو وہ دراصل اس قابل ہے کہ فریم کرا کے گول کمرے میں لگا دیا جائے۔ یہ لحاف عام طور پر ایک بڑے سے صندوق میں بند رہتا ہے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے اس خاکسار کو انتظار ہے کسی ایسے وقت کا جب اس کارساز کی قدرت، کاملہ کسی ملک کی فرمانروائی عطا کرے گی تو شاہی چھپرکھٹ پر یہ لحاف زیب دے گا۔ مگر اس مشاعرے کے لیے بیگم نے اس لحاف کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی۔ پھر گھر بھر کے تکیے جمع کیے گئے اور ان کا طبی معائنہ شروع ہوا کہ ان میں سے وہ کون سے دو تکیے ہیں جو کم سے کم مرمت کے بعد بادیٔ النظر میں تکیے سمجھے جا سکیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں بلوہ ہوگیا ہے اور یہ تکیے نہیں بلکہ اس بلوے کے زخمی یہاں لا کر تلے اوپر ڈھیر کر دیئے گئے ہیں۔ بمشکل تمام دو تکیے نظر انتخاب کا مرکز بنے اور طے پایا کہ تکیہ بذات خود کوئی چیز نہیں تکیے کو تو اس کا غلاف سجاتا ہے اور غلاف خدا کے فضل سے ایسے ایسے ہمارے یہاں موجود ہیں کہ لوگوں کو چاہیے کہ دور دور سے دیکھنے کو آئیں اور سیاحوں کی نظر پڑے تو تصویریں اتار لے جائیں۔ چنانچہ ان دو تکیوں کے لیے جو دو غلاف نکالے گئے ان میں سے ایک پر اُودے نیلے۔ پیلے ریشم سے کڑھا ہوا Wel com تھا اور دوسرے پر ایک ایسی چڑیا کی دیدہ زیب تصویر تھی جس کو دیکھ کر علم حیوانات کے ماہر حیران ہیں کہ یہ آخر کس نسل کی چڑیا ہے اور دنیا کے کس حصے میں پائی جاتی ہے۔ بستر کی چادر البتہ کوئی ایسی نہ تھی جو ایسے تکیوں اور ایسے لحاف کے ساتھ سج سکے۔ متعدد بکس ٹٹولنے کے بعد ایک خوبصورت چادر مل تو گئی مگر اس میں یہ نقص نکل آیا کہ اس کے کناروں پر چاروں طرف عجیب عجیب مصرعے چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً ع

روزئ خود میخورد برخوان تو

ظاہر ہے کہ ایسی چادر ساتھ لیجانے سے تو یہی اچھا تھا کہ بغیر بستر کے پہونچ جاتے۔ مگر واہ ری منتظم بیوی۔ دروازے کا ایک پردہ اتار کر اس کے کڑے نکال دیئے اور اب جناب وہ ایسی لاجواب چادر بنی ہے کہ بس دیکھا کیجیے۔ خدا خدا کر کے بستر اور سوٹ کیس کا سامان مکمل ہوگیا اور اب اس سفر کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک ذرا خوبصورت سا لوٹا دوسرے ذرا مناسب سلیپر۔ لوٹوں کے سلسلہ کی مجبوری یہ تھی کہ جو لوٹے صورت شکل کے اعتبار سے درست تھے وہ ٹپکتے تھے

اور ایک لوٹا جو ٹپکتا نہ تھا اس کی ٹونٹی خدا جانے کسی حادثہ میں ٹوٹ گئی تھی اور بیگم صاحبہ اس بات کی سخت مخالف تھیں کہ اتنے بڑے شاعر کے لیے ایک لوٹا تک کسی سے مانگا جائے۔ کافی غور و فکر کے بعد طے پایا کہ لوٹا دراصل عہد جہالت کی یادگار ہے اور اس روشنی اور ترقی کے دور میں بغیر لوٹے کے بھی زندگی بسر ہو سکتی ہے بلکہ وہ زندگی جو لوٹے کے ساتھ بسر ہو نہ ترقی یافتہ زندگی کہلاتی ہے نہ ترقی پسند زندگی۔ چنانچہ لوٹا تو لایا گیا تخفیف میں اور سلیپر کی جگہ بیگم صاحبہ نے مشورہ دیا کہ وہ پھول دار کھڑاویں رکھ لیں جن میں سے ایک کی کھونٹی رات سے غائب تھی۔ مگر حال ہی میں پتہ چلا کہ شطرنج کے مہروں میں رکھی ہوئی ہے اور بادشاہ کے بجائے اس لیے استعمال ہوتی ہے کہ شاہ موصوف فقیری لے کر مدت سے مفقود الخبر ہیں۔ بہر حال وہ کھڑاویں بھی احتیاطاً رکھ لیں کہ ”داشتہ آید بکار“۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کے لیے دن گنے جا رہے تھے۔ گھڑی میں آدھی رات کا الارم لگا کر سوئے تھے مگر الارم بجنے سے پہلے ہی بیدار ہو کر الارم کو بجنے کی زحمت سے بچایا۔ راتوں رات نہا دھو کر سج بن کر تیار ہو گئے اور صبح ہوتے ہی گھر سے اپنا سامان اور بیوی کی دعائیں لے کر اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ جب منزل مقصد پر شاندار استقبال ہونے والا ہو تو راستہ خواہ مخواہ طویل ہو جاتا ہے اور وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ ہر چند کہ اپنے نزدیک ٹرین میں سوئے بھی۔ مشاعرے میں جو غزل پڑھنے والے تھے اس پر بار بار نظر ثانی کی۔ اس کی دھن بٹھائی۔ کئی مرتبہ غسل خانہ میں جا کر آئینہ کے سامنے وہ غزل پڑھ پڑھ کر اپنے کو سنائی۔ داد پر سلام کرنے کے طریقوں کا ریہرسل کیا اور آخر جب منزل مقصد قریب آئی تو سوٹ کیس سے برش نکال کر پہلے سیاہ شیروانی کو صاف کیا۔ پھر وارنش کے پمپ کو چمکایا چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں مرتب کیں۔ ہاتھ منہ دھو کر بال بنائے جناح کیپ کے زاویے درست کیے۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آ گیا جس پر شعر و ادب کے ایک دیرینہ خدمت گذار کو اس کی خدمات کا صلہ ملنے والا تھا۔ شوق نے کہا مار چھلانگ پلیٹ فارم پر۔ ضبط نے کہا خیر مقدم کرنے والوں کو آنے دو۔ یہی وقت ہے رکھ رکھاؤ کا۔ چنانچہ ایک اخبار لے کر بیٹھ گئے جو اس وقت کسی ایسی زبان کا اخبار معلوم ہو رہا تھا جس کے گویا حرف شناس ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ انجن نے روانگی کی سیٹی دے دی اور اب اس رکھ رکھاؤ کو اٹھانا ہی پڑا۔ ہولڈال پلیٹ فارم پر پھینکا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لیا اور پلیٹ فارم پر آ گئے۔ جہاں حدِ نظر تک نہ اس عظیم الشان مشاعرے کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے۔ نہ پھولوں کے ہار لیے ہوئے مشاعرے کے رضاکار۔ نہ فوٹو گرافر۔ اخبار پر تاریخ دیکھی کہ کہیں مارے شوق کے ایک دن پہلے تو نہیں آ گئے۔ اسٹیشن کا نام پڑھا کہ کہیں غلط جگہ تو نہیں اتر گئے اور جب ہر طرح سے اطمینان کر لیا تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک صاحبزادے نے قریب آ کر کچھ سونگھنے کے انداز سے کہا:

”جناب لاہور سے تشریف لائے ہیں؟“

عرض کیا: ”جی ہاں حاضر تو ہوا ہوں لاہور سے، یہاں ایک مشاعرہ ہے۔“ وہ بات کاٹ کر جلدی سے بولے ”اوہو میں تو آپ کو بڑی دیر سے ڈھونڈھ رہا تھا اور اب تو مایوس ہو چلا تھا۔ بہر حال تشریف لایئے۔“ اور ایک قلی سے ارشاد فرمایا کہ سامان اٹھائے۔

اسٹیشن سے جائے قیام تک ایک ایسے تانگے پر لائے گئے جس کا گھوڑا ”لبّا سودا کے گھوڑے کی نسل کا چشم و چراغ تھا۔ اور ٹھہرائے گئے ایک ایسے خانۂ بے تکلف میں جو تھانوی کی رعایت سے کچھ تھان کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم تو دم بخود تھے مگر وہ سودا کے گھوڑے کی نسل کو گھوڑا دفور مسرت سے ہنہنا رہا تھا۔ اسٹیشن پر جس سناٹے کے ساتھ خیر مقدم ہوا تھا اس کے معنی یہ پیدا کیے تھے کہ اسٹیشن پر استقبال مناسب نہ سمجھا

گیا ہوگا اور طے ہوا ہوگا کہ جائے قیام پر گارڈ آف آنر کا معائنہ کرایا جائے۔ مگر یہاں بھی ایسی ویرانی سی ویرانی تھی کہ دشت کو دیکھ کر گھر یاد آرہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ایک صاحب دانت نکالے اور ناک ضبط کیے ہوئے تشریف لائے۔ آداب عرض۔ تشریف لایئے۔ بڑی لیٹ ہوگئی آج گاڑی۔“ کاش ان حضرات کو معلوم ہوتا کہ گاڑی سے زیادہ تانگہ لیٹ ہوا تھا جس کا گھوڑا عروض کی پابندی کے ساتھ ہر قدم ناپ تول کر اٹھاتا تھا۔ ان حضرت نے نہایت بے تکلفی سے فرمایا۔ ”میری رائے میں مشاعرے کے بعد ہی طعام کا بندوبست کیا جائے اس لیے کہ کافی دیر ہو چکی ہے۔“

عرض کیا۔ ”جی ہاں یہی مناسب ہوگا۔“

وہ حضرت بولے ”یہ رہا مشاعرہ دس قدم پر تو ہے ہی تشریف لایئے۔“

آگے آگے وہ حضرت اور پیچھے پیچھے یہ خاکسار۔ اس گلی میں داخل ہو کر اس گلی میں برآمد ہوئے اور اس گلی سے مڑ کر پھر ایک گلیارے میں پہونچے۔ یہاں تک کہ گلیاں بھی ختم ہوگئیں اور ایک سپاٹ میدان شروع ہوگیا جس کے ایک گوشے میں کچھ شامیانہ سا نظر آیا۔ کچھ روشنی بھی تھی اور زندگی کے کچھ ایسے آثار تھے جیسے کسی جنازے کی آمد پر قبرستان میں نظر آتے ہیں۔ ابھی ہم لوگ دس پانچ قدم اُدھر ہی تھے کہ ایک صاحب نے لپک کر ہمارے رہنما سے پوچھا۔ ”کیوں بھئی آگئے وہ حضرت یا لعنت بھیجی جائے؟“

رہنما نے انگشت شہادت لبوں پر رکھ کر آنکھ سے کچھ ایسا اشارہ کیا کہ وہ حضرت کچھ ٹھٹھک کر رہ گئے اور نہایت منافقت سے فرش راہ ہوتے ہوئے بولے۔ ”تشریف لائیں حضور بڑا انتظار کرایا آپ نے غالباً ٹرین کافی لیٹ تھی“ اور حضور جی ہاں۔ اور جی نہیں قسم کے واجبی جواب دیتے ہوئے پنڈال میں پہنچ گئے۔ جہاں کسی کے اشارے پر پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ تالیاں اس کسمپرسی کے عالم میں بڑی غنیمت محسوس ہوئیں اور وہ احساس کمتری جو خودکشی کی طرف متوجہ کر رہا تھا ان تالیوں میں جیسے اڑ سا گیا۔ ابھی پنڈال تالیوں سے گونج ہی رہا تھا کہ ایک نما نوجوان نے مائیکروفون کے قریب جا کر حاضرین کو مخاطب کیا۔

حضرات ہمیں افسوس ہے کہ ٹرین کے اتفاقاً لیٹ ہوجانے کی وجہ سے ہمارے مہمان محترم دیر سے پہونچے اور آپ کو انتظار کی صبر آزما گھڑیاں گذارنا پڑیں۔ حضرات اگر یہ عام مشاعرہ ہوتا تو آپ کی ضیافت طبع کے لیے ہم دوسرے شعراء کو پیش کرتے رہتے اور یہ وقت کشمکش انتظار میں یوں نہ کٹتا۔ مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ مشاعرہ قائداعظم میموریل فنڈ کے لیے منعقد کیا گیا ہے ارادہ یہ تھا کہ اس کی کل آمدنی اخراجات وضع کر کے اسی فنڈ میں دیدی جائے گی۔ ہم نے اس مشاعرہ کے لیے شعراء کی اچھی خاصی فہرست بنائی تھی مگر باوجود اس کے کہ ہم نے متعدد خطوط لکھ کر اپنے اس مہمان محترم کو جو تشریف لائے ہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مقصدی مشاعرے کی شرکت میں تجارتی لین دین سے کام نہ لیں۔ موصوف اپنے گراں قدر مطالبے سے قطعاً نیچے نہ اترے اور آخر ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ منہ مانگی رقم آپ کو پیش کردی جائے خواہ کسی اور شاعر کو ہم نہ بلا سکیں۔“ بھرے پنڈال سے نعرہ بلند ہوا۔ ”شرم شرم“

اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم کچھ ڈوب سے رہے ہیں۔ مقرر کی تقریر جاری تھی۔

حضرات ہمارا اور آپ کا فرض اب یہ ہے کہ اپنے مہمانِ محترم پر قناعت کریں اور پورا وقت آپ ہی کو دے کر آپ کا کلام ذرا تفصیل سے سنیں۔“

ہم کو محسوس ہوا گویا ہم مشاعرے میں نہیں بلکہ ہوائی جہاز پر سفر کر رہے ہیں اور جہاز اس وقت بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا ہے۔ اسی وقت خدا جانے کس بزرگ نے سہارا

دے کر ہم کو مائیکروفون کے قریب لا کر کھڑا کیا اور ہم نے بہت کچھ سنبھل کر ایک غزل شروع کی جس کا پہلا مصرعہ اس غزل کا تھا جو ہم پڑھنا نہ چاہتے تھے مگر دوسرا مصرعہ اس غزل کا تھا جو ہم پڑھنا چاہتے تھے یعنی دوسرا مصرعہ اس غزل کا تھا جو خدا جانے اس وقت کیوں یاد آ گئی تھی۔ پنڈال قہقہوں اور تالیوں سے گونج رہا تھا۔ معلوم نہیں کس خدا ترس کو ہم پر رحم آیا اور ہمارے سامنے پانی کا گلاس پیش کیا گیا۔ اس عرصہ میں سکریٹری صاحب مشاعرے نے سامعین کو شرافت کے چند درس دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ چپ ہو گئے اور پانی پینے کے بعد ہم نے بجائے غزل پڑھنے کے اعلان کیا۔

''حضرات میں نے اس مشاعرہ کمیٹی سے جو مطالبہ کیا تھا۔ اس کے لیے میرا ارادہ یہ تھا کہ میں وہ کل رقم اپنی طرف سے قائداعظم میموریل فنڈ میں پیش کر دوں گا چنانچہ سکریٹری صاحب مشاعرہ سے درخواست کروں گا کہ وہ رقم میری طرف سے اس فنڈ میں شامل کر لی جائے۔''

کسی غزل پر مجھ کو کبھی اتنی داد نہ ملی تھی جتنی اس اعلان پر ملی اور پھر جو غزل پڑھی مقبول ہوئی۔ (ماہِ نو کراچی)

اگر میں تھانیدار ہوتا!

''جمنا مہاراج! جمنا مہاراج۔''

جمنا مہاراج۔ ''کون ہے بھیا۔''

''ارے مہاراج نکلو تو سہی۔ میں ہوں پرشادی۔''

جمنا مہاراج : ''کون؟ پرشادی بھیا۔ کہو کیسے درشن دئے؟''

پرشادی : ''ارے درشن ورشن نہیں دئے وہ دیکھو تمہارے کھیت میں ایک گھوڑا جانے کہاں سے گھس گیا ہے اور سب کھیت ٹھکانے سے لگائے دیتا ہے۔''

جمنا مہاراج : ''کیا کہا گھوڑا؟ لاتا تو میری لاٹھی۔''

پرشادی : دوڑو جلدی سے وہ تو نہ جانے کب سے کھیت کو کھلیان بنا رہا ہے''

جمنا مہاراج : ''پرشادی بھیا تم ادھر سے گھیرو اور میں ادھر سے ہکاتا ہوں وہ لاٹھی دی ہو کہ آج ہو ساڑھے تین ٹانگ کا ہو جائے۔''

پرشادی : ''پہلے پکڑ لو اس کو پھر ذرا کٹائی کی جائے۔''

جمنا مہاراج : ''مگر ہے وہ کدھر؟''

پرشادی : ''وہ دیکھو وہ۔''

جمنا مہاراج : ''وہ؟''

پرشادی : ‘‘ہاں ہاں وہ کیا ہے۔’’

جمنامہاراج : ‘‘ارے بھیا وہ تو داروغہ جی کا گھوڑا ہے بس چپکے سے ہکا دو۔ مارنا وارنا نہیں۔’’

پرشادی : ‘‘کیا کہا داروغہ جی کا گھوڑا ہے۔ تو بھیا تم ہی ہکاؤ۔’’

جمنامہاراج : ‘‘تو کیا ہکایا بھی نہ جائے اس کو۔’’

پرشادی : ‘‘تم جانو مہاراج ہم تو اس گھوڑے سے کچھ نہ بولیں گے۔’’

جمنامہاراج : ‘‘کیوں نہ بولو گے۔’’

پرشادی : ‘‘ارے ہاں کون حاکموں کی بات میں بولے داروغہ جی ہمارے مالک ہیں۔ بھلا ہماری یہ مجال ہے کہ ہم ان کے گھوڑے سے بولیں۔’’

جمنامہاراج : ‘‘اچھا اچھا وہ دیکھو نہ تم ہکاؤ نہ میں وہ تو خود ہی کھیت سے نکل گیا۔’’

پرشادی : ‘‘چلو چھٹی ملی۔’’

جمنامہاراج : ‘‘مگر بھیا آج یہ معلوم ہوگیا کہ تم بھی داروغہ جی سے بہت ڈرتے ہو۔’’

پرشادی : ‘‘ڈرتے نہیں ہیں مگر ہاں یہ بات ہے کہ وہ بہت بڑے حاکم ہیں۔ ارے مہاراج ہم تو ہم زمیندار صاحب ان کا رعب مانتے ہیں اور سچ پوچھو تو ان سے بڑا حاکم ہے کون اب۔’’

جمنامہاراج : ‘‘سچ کہتے ہو بھیا مگر یہ تو بتاؤ کہ اگر تم کو داروغہ جی بنا دیا جائے تو تم کیا کرو۔’’

پرشادی : ‘‘کیا بات کرتے ہو مہاراج تم بھی کوئی سنے تو کہے کہ دارو پی گئے ہیں۔’’

جمنامہاراج : ‘‘پھر بھی آخر یہ بتاؤ کہ تمہاری تھانیداری کیسی ہو۔’’

پرشادی : ‘‘مہاراج سچ جانو کہ اگر ہم کو داروغہ بنا دو تو ہم دکھا دیں کہ داروغہ ہوتا کیا ہے۔ ہم ان داروغہ کی جگہ ہوتے تو آج سب کہتے کہ ہاں یہ ہے داروغہ۔’’

جمنامہاراج : ‘‘وہ کیسے بھلا؟’’

پرشادی : ‘‘وہ ایسے کہ ہماری داروغائی میں تھانے پر دن رات بس ڈانٹ ڈپٹ۔ لکھا پڑی۔ پہرا چوکی نہ ہوتا۔ ہاں موقع موقع سے یہ باتیں ہوجایا کرتیں۔ نہیں تو ہم بھائی برادری کو تھانے میں جمع رکھتے اور سب کے بیچ میں داروغہ بن کر بیٹھتے رنگ رلیاں ہوتیں گانا بجانا کھانا کھلانا پینا پلانا ہوا کرتا اور یہ معلوم ہوتا کہ جانو ہر وقت تھانے میں کوئی برات ٹھہری ہوئی ہے۔’’

جمنامہاراج : ‘‘یہ وزن ہوتے پرشادی بھیا۔’’

پرشادی : ‘‘اور نہیں تو کیا ہم بھی دوغہ جی کی طرح ہر وقت کمر کسے بیٹھے رہتے۔ اور راتوں کو در بدر گشت کرتے۔’’

جمنامہاراج : ‘‘تو یہ کہو کہ ریاست ہوتی تمہاری تھانیداری بھی۔’’

پرشادی : ‘‘اب تم ہی دیکھو مہاراج کہ اتنا بڑا حاکم جس کو زمیندار تک جھک جھک کر سلام کریں ہر وقت دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ یہ بھی کوئی حاکم ہونے کی نشانی ہے۔ ہم تو بس اپنے چھپر کھٹ پر نائی سے پیر دبواتے اور ناریل گڑگڑاتے۔ ہر وقت جنگل میں منگل ہوتا۔ تھانے میں پکوان پکتے ہم بھی خوش رہتے اور ہمارے سپاہی بھی۔’’

جمنامہاراج : ''یہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ جب تمہارا کوئی حاکم پوچھتا تو کیا جواب دیتے۔''

پرشادی : ''ہمارا حاکم کون ہوتا ہم تو سب کے حاکم ہوتے۔ اور جو کوئی ہماری بات میں ٹانگ اڑاتا تو پھر تم جانو کہ اس کو بندھوا کر ڈنڈا مہاراج سے خبر لی جاتی۔''

جمنامہاراج : ''تو یہ کہو کہ تمہارا کوئی حاکم ہی نہیں ہوتا۔''

پرشادی : ''کیسی باتیں کرتے ہو مہاراج دورغہ کا بھی کوئی حاکم ہوسکتا ہے۔ ارے مہاراج زمیندار تک سلام کرتا ہے اور کسی کو کیا کہیں۔''

جمنامہاراج : ''تو بھیا ان رنگ رلیوں میں چوری چکاری بھی خوب ہوتی۔''

پرشادی : ''چوری چکاری کی تو بات یہ ہے کہ ہم بھیا سب سے صاف صاف کہہ دیتے کہ جو کوئی کسی چور کو پکڑ کے ہمارے پاس لے آئے تو ہم خود گلے گلے پانی اس کے لیے تیار ہیں کہ مارتے مارتے بھرکس نکال دیں مگر جو کوئی ہم سے یہ کہے کہ چور تو چوری کر کے بھاگ جائے اور ہم اس کے لیے دوڑے دوڑے پھریں تو صاف بات یہ ہے کہ ہم ٹھہرے حاکم کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔''

جمنامہاراج : ''ہاں یہ تو قاعدے کی بات ہے۔ مگر بھیا یہ بھی تو سمجھو کہ پولیس کا کام یہ ہے کہ رعایا کو چوروں سے بچائے بدمعاشوں سے بچائے اور ان کی جان اور ان کے مال کی رکھوالی کرے۔''

پرشادی : ''یہ سب جھگڑا ہے مہاراج ہم حاکم ہو کے یہ نوکری نہیں کر سکتے۔ ہاں چور کو پکڑ لاؤ تو سزا دینا ہمارا کام۔ جتنی کہو سزا دیدیں اور جس کو کہو سزا دے دیں مگر اس کے لیے مارے مارے پھرنا ہم حاکموں کا کام نہیں ہوسکتا۔''

جمنامہاراج : ''مگر پرشادی بھیا تمہاری دورغائی ورغائی میں گاؤں والوں کا تو راج ہوتا۔''

پرشادی : ''بھلا مہاراج یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ مگر ایک بات ہے کہ سب گاؤں والوں کا راج نہیں ہوسکتا تھا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ نتھا چمار نے ہمارے بیل کو ذرا سا سینگ مارنے پر لاٹھی ماردی۔ ہم بھیا چپ ہو رہے کہ کون اس کے منھ لگے لیکن اگر دروغہ ہوتے تو بس پھانسی ہی دیدیتے دو تین برس کی۔ ہاں جو گاؤں والے ہمارے بھائی برادری کے ہیں اور بھائی برادری رکھتے ہیں ان کے لیے ہماری دروغائی میں راج ہوتا۔''

جمنامہاراج : ''اور جو ہم اس وقت تمہارے گھوڑے کو اپنے کھیت سے مار کے نکال دیتے تو؟''

پرشادی : ''یہ بات تو ذرا بیڈھب کہی۔''

جمنامہاراج : ''نہیں نہیں سچ سچ بتاؤ کہ تم کیا کرتے۔''

پرشادی : ''سچ پوچھو تو ہم کو مہاراج بڑا غصہ آتا اور تمہارا کھیت روندوا دیتے گھوڑوں سے۔''

جمنامہاراج : ''یہ بات ہے کہ تمہارے دروغہ جی سے اتنے ڈرتے کہ ان کے گھوڑے کو بھی نہ ہنگایا۔''

پرشادی : ''ہاں مہاراج کون حاکموں کے گھوڑوں سے بولے۔''

جمنامہاراج : ''تو بھیا تمہاری دروغائی سے یہی دروغائی اچھی ہے کہ ہم نے بیسوں دفعہ اس گھوڑے کو مار مار کر نکالا ہے مگر ہمار کھیت آج تک

گھوڑوں سے روندا نہیں گیا۔"

پرشادی : "سچ کہو کیا تم نے دروغہ جی کے گھوڑے کو مارا بھی ہے؟"

جمنا مہاراج : "ہمارا کھیت خراب کرے تو کیوں نہ ماریں۔"

پرشادی : "تو بھیا تم دروغہ ہو سکتے ہو، ہم نہیں۔"

جمنا مہاراج : "یہ بھی ایک ہی کہی پرشادی بھیا تم نے ہاہاہاہا۔"

پرشادی : "ہاں دادا۔ یہ ہمارا بوتا نہیں کہ دروغہ کے گھوڑے کو ماریں ہاہاہاہا۔"

سسرال

گیدڑ کی جب موت آتی ہے وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ شہری کی جب شامت آتی ہے تو وہ دیہات میں شادی کر لیتا ہے۔ یہ شامت ہمارے بھاگ میں بھی تھی۔ خیر یوں تو ہم بھی کون سے کلکتہ، بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ مگر پھر بھی شہر میں رہے سہے۔ شہر میں پڑھے لکھے لیجیے ہو گئے شہری اور لگے دیہات سے گھبرانے۔ مگر بڑے بول کا سر تو نیچا ہو کر ہی رہتا ہے۔ آخر پھر اسی دیہات میں بیوی کی بھیگ مانگتے ہوئے پہونچے اور بہت کچھ دوڑ دھوپ کے بعد موضع بھد یسل کے زمیندار صاحب نے ہم کو اپنی غلامی میں لے لیا۔

ہمارے یہ سسر صاحب بڑی آن بان کے زمیندار ہیں اور انسان تو ایسے ہیں کہ اگر شہر میں آ جائیں تو لوگ ان کو دور دور سے دیکھنے آئیں۔ ایک ہے ان کے پاس لٹھ جو ہم سے کچھ ہی پتلا ہوگا۔ دو ڈھائی سیر تو لوہا اس میں جڑا ہوا ہے اور کوئی آدھ سیر کے قریب چاندی۔ ہم نے ایک مرتبہ اگر اس لٹھ کو مگدر کے طور پر اٹھایا تو ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر لٹھ کو ہم روز سویرے دو ایک مرتبہ اٹھا لیا کریں تو اس سے سینہ بھی بڑھے گا اور بازو کے پٹھے بھی چوڑے چکلے پہلوانوں جیسے ہو جائیں گے۔ دوسری چیز ہے ہمارے سسر صاحب کا جوتا جو دور سے تو ہوائی جہاز معلوم ہوتا ہے۔ قریب جائیے تو فرنیچر کے قسم کی کوئی چیز دکھائی دیتی ہے اور جب بالکل پاس پہونچ کر دیکھیے تو معلوم

ہوتا ہے کہ اس گاؤں بھر کے لوگوں نے الگ الگ جوتے بنوانے کے بجائے ایک ہی جوتا بنوالیا ہے اور سب اس کو ایک ساتھ پہنتے ہوں گے۔ اگر یہ جوتا ہم کو مل جائے تو ہم اس سے سوٹ کیس کا کام نکالیں۔ ان دونوں چیزوں سے یہ اندازہ تو ضرور ہو سکتا ہے کہ ہمارے سسر صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ ہمارے ایسے لوگ تو بھنگے ہیں ان کے سامنے۔ اللہ ہماری نظر بد سے بچائے دیو کے دیو ہیں۔ منہ میں بالٹی لگا کر کھڑے کھڑے پانچ چھ سیر دودھ پی جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تھے تو شہر کے کسی ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ آپ گُن کر روٹیاں کھایا کیجیے تو وہ بے چارے گن کر پچیس تیس روٹیاں کھا جاتے تھے۔ ان کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ پہلی مرتبہ تو ان کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ کر ہم ایسا سمجھے تھے کہ یہ طے کر لیا تھا کہ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر ان کی لڑکی سے ہم قیامت تک شادی نہیں کریں گے نہ جانے یہ کس دن ہم کو اٹھا کر منہ میں رکھ لیں مگر اب عادت پڑ گئی ہے دیکھتے دیکھتے۔

یہ تو سب کچھ ہے مگر سسر صاحب اگر دنیا میں کسی کی بات مانتے ہیں تو وہ ہماری سکے ہیں کہ شہر کا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ مڈل سے بھی آگے تک پاس ہے اس کی بات نہ مانیں گے تو کیا تکونو کی بات مانیں گے جس نے شہر میں جا کر کھیتوں کا مقدمہ ہی نہ جانے کیا الٹی سیدھی بات کر کے ہرا دیا۔

خیر اب سسر صاحب کی ایک ایک بات کہاں تک بیان کی جائے اس کے لیے تو ایک الگ کتاب لکھنے کا خود ان ہی سے وعدہ کر چکے ہیں۔ مگر اس وقت ان کی چھوٹی لڑکی کے بیاہ کا حال سن لیجیے کہ وہاں کا کیا حال تھا اور ہم پر کیا گذر رہی تھی۔ ہم کو بہت دن پہلے سے موضع بھدیسل بلا لیا گیا تھا اور ایک ایک بات ہم سے پوچھ کر کی جا رہی تھی۔ اصل میں یہ شادی بھی خود ہم ہی نے ٹھہرائی تھی۔ ہمارے ایک

دوست تھے اور ہم چاہتے تھے کہ شہر میں ہماری طرح کا ایک آدھ دیہاتی داماد اور بڑھے۔ ہمارے سسر صاحب کو تو بس اتنا ہی اطمینان کافی تھا کہ یہ شادی ہم نے ٹھہرائی تھی مگر ہمارے دوست کی جان پر بنی ہوئی تھی کہ اگر اس کم بخت نے زندگی بھر کا مذاق کر دیا تو کیا ہوگا۔ رہ گئے ہم تو ہمارا حال یہ تھا کہ ہم سسر صاحب کے اس اطمینان کا خون کرنا ہی نہیں چاہتے تھے اور اپنے دوست سے مذاق کرنے کی نیت بھی نہ تھی۔ البتہ یہ ڈر ضرور لگ رہا تھا کہ معلوم نہیں دیہات کی کس بات کو مذاق سمجھ بیٹھیں۔ اب ہماری سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ دلہن کو ہاتھ کا کتا اور ہاتھ کا بُنا جو جہیز دیا جانے والا تھا وہ کسی طرح ٹل جائے تو اچھا ہے۔ اس لیے کہ خود ہماری بیوی کے جہیز میں جو کرسی آئی تھی اس کو ہم بہت دنوں تک گھڑونچی سمجھتے رہے اور جب پتہ چلا کہ یہ کرسی ہے تو گاؤں گئے تھے سسر صاحب سے پوچھنے کہ اس پر بیٹھنے کا طریقہ کیا ہے۔ مطلب یہ کہ انھیں تمام باتوں سے ہم اپنے دوست کو بچانا چاہتے تھے اور بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ وہاں دھڑا دھڑ زیور پر زیور ڈھل رہے تھے۔ جن میں سے ایک بھی اس قابل نہ تھا کہ اس کو زیور سمجھ کر پہنا جا سکے۔ شہر میں ان چیزوں سے ورزش کی جاتی ہے۔ آخر ہم کو دخل دینا ہی پڑا اور ٹھیک اس موقع پر جب کہ ہمارے سسر صاحب ڈھائی تین سیر کی ایک جھانجھ لیے ہوئے اپنے نسیم سے کہہ رہے تھے کہ ہلکی رہی یہ، ہم سے ضبط نہ ہو سکا اور ہم نے سسر صاحب سے پوچھ ہی لیا۔ ''بھائی ابا یہ کیا ہے؟'' ہم ان کو بھائی ابا اس لیے کہتے تھے کہ ہماری بیوی ان کو یہی کہتی تھیں ہمارے سوال پر جانجھ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جھانجھ ہے بھیا پر میں یہ کہتا ہوں کہ یا تو چیز نہ دی جائے اور یا دی جائے تو ایسی کہ ناک نہ کٹے'' ہم نے دبی زبان سے کہا۔ ناک نہ کٹے'' چاہے پیر ٹوٹ جائے'' چونک کر بول'' ہائیں! پیر کی کیا بات ہوئی!'' ہم نے ان کو سمجھانے کے لیے آگے کھسک کر کہا۔'' بھائی ابا یہاں آپ

لوگ زیور کو تو دیکھتے ہیں اور اس بے چاری کو بھول جاتے ہیں، جس کو زیور پہننا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ یہ جھانجھ، یہ اس کے بعد کڑے، پھر چھڑے اور ایسی ایسی نہ جانے کیا کیا چیزیں پہننے کے بعد اس غریب کا پیر بھی اٹھ سکے گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو چیز آپ دینا چاہتے ہیں وہ کم سے کم ایسی تو ہو کہ جو اس کے کام آسکے۔ شہر میں بیاہ کر جا رہی ہے۔ زیور ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی شہر والوں کا بھی دم نکل جائے اور دولھا کو بھی دھڑکن ہونے لگے۔ جب سے میں آیا ہوں چپکے چپکے تمام انتظام دیکھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں ہنس رہا ہوں کہ آخر آپ کا ارادہ کیا ہے۔ جہیز کا جو سامان آپ تیار کرانا چاہتے ہیں اس کے لیے کم سے کم ایک پوری ریل گاڑی کی ضرورت تو ہوگی جو اس لڑائی کے زمانے میں تو مل نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں جو لڑائی کی وجہ سے لوگ اپنے کو ہلکا پھلکا رکھنا چاہتے ہیں آپ اپنی لڑکی اور داماد کے اوپر یہ بوجھ لاد رہے ہیں جس کو لے کے کہیں نہ آیا جا سکے۔ نہ جایا جا سکے۔ دیجیے تو ایسی چیز دیجیے کہ جس سے لڑکی بھی فائدہ اٹھا سکے داماد بھی خوش ہو اور دیکھنے والے بھی دیکھیں کہ عقل صرف شہر میں نہیں بٹی ہے دیہاتوں میں بھی پہونچی ہے۔“ جھانجھ ایک طرف رکھ کر سر سے پیر تک سوالیہ نشان بن گئے اور گل مچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولے ”تو بتاؤ نا بھائی آخر میں نے تو سب کچھ تم پر چھوڑ ہی رکھا ہے۔ اب میں شہر والوں کی سی انگریزی پڑھی عقل کہاں سے لاؤں ایسے میں سویرا ہے...... اب بھی جو کہہ دو گے ہو جائے گا“ ہم نے کہا۔ ”پہلے یہ بتایئے کہ آپ کا ارادہ جہیز پر کتنا روپیہ صرف کرنے کا ہے؟“ ایک دم سے ڈنکار کر منیم کو پکارا کہ بڑے بھیا کے بیاہ کا کھاتہ لاؤ اور ہم سے کہنے لگے۔ میرا خیال یہ ہے بلکہ جہاں تک یاد پڑتا ہے ساڑھے تین ہزار کا جہیز تمہاری بیوی کو دیا تھا بس اسی کے لگ بھگ سمجھ لو“ ہم نے کہا بس تو ٹھیک ہے آپ یہ تمام روپیہ جنگی قرضے میں دے کے اس کے سرٹیفکیٹ جہیز میں دے

دیجیے سسر صاحب پر ایک دم بجلی سی گری تڑپ کر بولے ”ہائیں! کیا کہا؟ ارے بھائی اُردو میں سمجھاؤ نا۔“

ہم نے منھ پھیر کر مسکرانے کے بعد کہا ”مطلب یہ ہے کہ یہ روپیہ تو دے دیجیے سرکار کو قرض اور اس کی پکی رسید لڑکی کے حوالے کر دیجیے۔ جب لڑائی ختم ہو جائے گی تو اسی روپیہ سے جو منافع کے ساتھ واپس ملے گا وہ اپنی مرضی کا جو چاہے گی بنوا لے گی“ آج غالباً پہلی مرتبہ ان کو اس بات کا افسوس ہوا کہ ان کی بڑی لڑکی کی قسمت ایک پاگل کے ساتھ پھوڑی گئی ہے کہنے لگے۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو بھیا نہ جانے لڑائی کا اونٹ کس کل بیٹھے۔ کون جیتے کون ہارے پھر کس کو رسید دکھا کر روپیہ مانگتے پھریں گے۔“

ہم نے ان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیے اس کو یوں سمجھیے کہ اول تو ہمیں جیت رہے ہیں اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی رقموں اور ذرا ذرا سی ہمدردیوں کے بل بوتہ پر جیت رہے ہیں اور فرض کر لیجیے کہ نہ بھی جیتیں تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام سامان یہ تمام زیور اور یہ سب کچھ جو آپ جہیز میں دے رہے ہیں باقی بچ جائے گا دشمن کی لوٹ مار اس کو باقی رہنے دیگی۔ بم کے گولے کسی چیز کو استعمال کے قابل رہنے دیں گے۔ یا استعمال کرنے والوں کو صحیح سلامت چھوڑیں گے۔ اس وقت تو آپ کے اسی روپیہ سے دشمن کو پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہی روپیہ ہم گھروں میں دبا کر رکھ لیں تو وہ نہ تو ہمارے کام آئے گا اور نہ سرکار کے کام بلکہ دشمن لٹیرے اس کو یا تو لوٹ لیں گے یا تباہ کر کے رکھ دیں گے۔“ اتفاق کی بات تھی کہ یہ باتیں کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آ رہی تھیں کہنے لگے ”بات تو کچھ جچتی ہوئی ہے۔ پر یہ تو سوچو گاؤں والے کیا کہیں گے برادری کیا تھوکے گی، سب یہی کہیں گے نا کہ لونڈیا کو ایک کاغذ تھما دیا اور چلتا کیا۔“ ہم نے کہا۔ ”برداری میں سب سے بڑے بزرگ آپ

ہیں اور گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار بھی آپ ہیں۔ اگر آپ ہی ایسی مثالیں قائم نہ کریں گے تو کون کرے گا۔'' مٹھی میں اپنی داڑھی کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا۔ ''اچھا۔ تو میں کل جواب دوں گا ذرا تمہاری ساس واس سے بھی پوچھ لوں۔'' ساس تک غنیمت تھا مگر یہ واس بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گاؤں بھر کی بڑی بوڑھیوں کا مشورہ لیا جائے گا۔ جو سب کی سب ہماری واس تھیں۔ مگر بڑے میاں کو ہم ایسا رام کر چکے تھے کہ دوسرے دن تک تمام ساسیں اور تمام واسیں لاکھ چیخیں چلائیں مگر ہم کو صبح ہی ساڑھے تین ہزار روپے مل گئے کہ شہر جا کے ان کو جمع کرو اور پکی رسید لا کے دکھاؤ۔

ختم شد